ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اکتوبر ۱۹۸۹ء

میں ساز بجاتی ہوں سکھ کا
تم گیت امن کے گاؤ

بچوں کے عالمی دن پر امن کی پری کا پیغام

اس شمارے کے ساتھ دو خوبصورت اسٹیکر

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں !

ٹپال چائے

دانے دار

لیف بلینڈ

فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین

خوف کی اِک اور وادی کا سفر
ہو رہا ہے آپ کے اِصرار پر

پہلے سے زیادہ خوفناک کہانیوں، واقعات، حادثات اور مضامین کے جلوس کے ساتھ

آنکھ مچولی **خوفناک نمبر** کا ایک اور

جنوری ۱۹۹۰ء میں شائع ہو رہا ہے۔

اس خوفناک نمبر کے لئے آپ بھی تو کچھ لکھئے، مثلاً

- کوئی خوفناک کہانی یا واقعہ،
- کوئی سنسنی خیز نظم یا حادثہ
- دہشت سے متعلق کوئی مضمون
- کوئی دل ہلا دینے والی داستان
- یا کوئی خوفناک تصویر

لفظ لفظ خوف سے تھرتھراتا ہوا۔ حرف حرف ہیبت سے پھڑپھڑاتا ہوا

جلدی کیجئے

خوفناک نمبر کیلئے بے خوف ہو کر لکھئے آنکھ مچولی آپ کی تحریروں کا منتظر ہے

ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دیا جائے گا ----

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے کتنے سستے کتنے پیارے

دسمبر ۱۹۸۹ء سے قبل ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیئے مہّاتی کہانیوں کی خوبصورت کتاب "حق اسکواڈ" کا تحفہ بالکل مُفت

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

- اپنے آرڈر کے ساتھ آپ ہمیں ۱۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوا دیجیے۔
- ہم آپ کو پہلا شمارہ بذریعہ وی پی بھجوا دیں گے۔ آپ ۱۴۰ روپے کے عوض وی پی چھڑوا لیجیے۔

تمام تفصیلات علیحدہ کاغذ پر بھجوائیے۔
۱ خریدار کا نام ۲ مکمل پتا ۳ فون نمبر (اگر ہو)
۴ رسالہ کس ماہ سے شروع کیا جائے ۵ دستخط

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

ABC آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مُدیرِ اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مُدیر مسئول تجمل حسین چشتی

مُشاورت مُشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مُدیرانِ اعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلس ادارت شاہ نواز فاروقی، سید خورشید عالم

خطّاطی عارف سعید

فون نمبر - ۲۹۹۱۷۸۰

- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
- ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیرالدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد ۴ شمارہ ۴ اکتوبر ۱۹۸۹ء ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

ناشر ظفر محمود شیخ طابع زاہد علی مطبع لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت ۱۰ روپے، ۷ درہم، ۷ ریال
زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

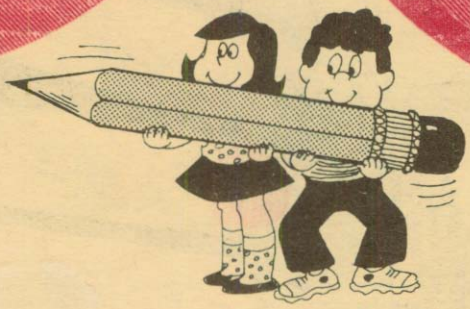

ہمارا کارٹون بنائیے

ہمارا حوصلہ دیکھئے، ہم آپ کو اپنا مذاق اُڑانے کی دعوت دے رہے ہیں

ہمارا کارٹون بنائیے ـــــ مگر
شائستگی اور احترام کا خیال رکھتے ہوئے بدتمیزی اور بے ادبی سے بچتے ہوئے
یاد رکھئے ـــ شستہ مذاق دُنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

- آپ کے خیال میں آنکھ مچولی کے مدیر اور ادارے کے دوسرے لوگ دفتر میں کس طرح کام کرتے ہوں گے۔
- آپ ہمارے متعلق جس طرح بھی سوچتے ہوں اُسے کارٹون کی شوخ لکیروں کی صورت میں ایک صاف کاغذ پر نقش کیجئے اور ہمیں بھجوا دیجئے۔
- ہم شائستہ مذاق اور خوبصورت آرٹ کی قدر کرتے ہوئے آپ کے کارٹون شائع بھی کریں گے اور آپ کو انعام بھی دیں گے۔

حسنِ ترتیب

٨ تاریخ کے دریچے سے

٩ ماہِ رواں کی پہلی بات

١٠ ڈاکیہ ڈاک لایا

١٤ امن کی پری کا پیغام

١٨ میم سے مینڈک — اُمِ رمیصا

٢٣ دھاڑیل قسط ٢ — نعیم بلوچ

٣٠ مقابلہ — کلثوم واحد

٤١ بدلتے ہیں رنگ بے زباں کیسے کیسے — سلمیٰ سلیم

٤٢ انجانی مہم قسط ٢ — محمد نوید مرزا

٤٧ نیوٹن — طاہر مسعود

٥١ سائنس انکوائری — سید ایاز محمود

٥٩ احسان فراموش آدمی — شاہنواز فاروقی

٦٤ آپ کی جدوجہد (نظم) — شاہنواز فاروقی

٦٦ کھٹے میٹھے (منتخب لطائف)

٧١ مولا جٹ کے ہمسائے — محمد افضل شاہین

٧٥ کرسٹاٹن کا خواب — سید عرفان علی یوسف

٨٥ اعتبار — عمران مشتاق

٩٠ اچھے بچے کی دُعا (نظم) — سید نظر زیدی

٩١ میرا دوست — فرحین نگار

٩٥ وعدہ (آخری قسط) — محمد سلیم مغل

١٠٢ برفانی انسان — رضاء اللہ طالب

١٠٧ سیف گیمز — عبدالرشید شکور

١١٦ ابّو کا خطاب (نظم) — راجہ مہدی علی خان

١١١ خدا پاکستان کو سلامت رکھے — محمد جاوید خالد

١١٧ کینیڈی سے وائٹ ہاؤس تک — سید خورشید عالم

١٢٠ کیا آپ صحت مند ہیں؟ — ساجد سعید

١٢٣ بھُن بھُن چراٹی مہالتا — نیر ابدالی

١٢٧ جستجو شرط ہے — اسامہ بن سلیم

١٣١ گنی چُنی معلومات — عقیل عباس جعفری

١٣٤ سچّی آپ بیتی — ڈاکٹر تسنیم شکیل احمد

١٣٦ حرفوں کا گورکھ دھندا — عظیم مغل

١٣٩ ننّھی نگارشات

١٥١ سالگرہ کے ساتھی (قلمی دوستی)

١٥٤ امّی ابّو کا صفحہ — شین فاروقی

تاریخ کے دریچے سے

جارج واشنگٹن کو بحری فوج میں شامل ہونے کا شوق ہوا۔ چنانچہ اس کے سپرد ایک خدمت کی گئی۔ سمندر کے سفر پر روانہ ہونے سے قبل وہ اپنے گھر میں ماں کو الوداع کہنے گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کی ماں اپنے بیٹے کی جُدائی کے خیال سے رو رہی ہے۔ اپنی ماں کو رنج کی حالت میں دیکھ کر وہ سیدھا جہاز کی طرف گیا اور نوکروں کو حکم دیا کہ

"جہاز سے تمام سامان اُتار لیا جائے۔ میں اپنی خاطر اپنی پیاری ماں کو دریائے غم میں ڈبونا نہیں چاہتا۔"

جب اس کی ماں کو معلوم ہوا تو اُس نے جارج واشنگٹن کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہنے لگی۔

"پیارے جارج خدا ان بچّوں پر اپنی برکت نازل کرتا ہے جو اپنی ماؤں کی عزّت اور ان کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خدا تمہیں اس محبت اور عزّت کا اجر ضرور دے گا۔"

اور شاید اسی فرمانبرداری کے صلے میں خدا نے جارج واشنگٹن پر اپنی رحمت نازل کی اور اس کی محنت رنگ لائی اور وہ ایک دن امریکہ کا صدر بنا۔

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی ملک کے تمام اخبارات کی ایک نمائندہ انجمن ہے۔ اس انجمن نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ اخبارات کی چھٹیاں بہت زیادہ ہونے لگی ہیں۔ ان کی چھٹیاں کم ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے جب اخبار ہی نہیں چھپے گا تو لوگ حالات و واقعات سے کیسے واقف ہوں گے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ نہایت معقول ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اخبارات کی چھٹیاں زیادہ ہونے کا احساس تو کر لیا گیا لیکن اب تک اس بات پر توجہ نہیں دی گئی ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں بھی ضرورت سے بہت زیادہ چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ایک تو آئے دن کے ہنگاموں کی وجہ سے ہنگامی چھٹیاں ہوتی ہیں۔۔۔ اور جب حالات ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں اور تعلیمی ادارے کھلتے ہیں تو پھر معمول کی چھٹیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی دین کی کسی برگزیدہ ہستی کے حوالے سے، کبھی کسی ملّی شخصیت کے نام پر، کبھی کسی قومی دن کے احترام میں۔ حد تو یہ کہ کرکٹ میچ جیتنے کی خوشی میں بھی چھٹی کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ نت نئی چھٹیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

تعلیمی اداروں میں اس کثرت سے چھٹیوں کی صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہئے۔ پہلی بات تو یہ سوچنے کی ہے کہ تعلیمی اداروں میں اتنی ڈھیر ساری چھٹیوں کا مقصد کیا ہے؟ اگر اس کا مقصد قومی دنوں اور ان شخصیتوں کا احترام ہے جن کی پیدائش اور وفات کے حوالے سے چھٹی دی جاتی ہے تو پھر یہ سوچنا چاہئے کہ کیا چھٹی منا کر ہم احترام کے تمام تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں کہ جن شخصیتوں نے اپنے شب و روز کی محنت سے عظیم کارنامے انجام دیئے جنہوں نے ساری زندگی آرام کے بجائے کام کیا ہم اُن کی یاد اس طرح مناتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی ادارے بند ہو جاتے ہیں، کلاس روم اور لائبریریوں پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ ہماری رائے میں اس طرح کی تعطیلات ان شخصیات کے کام اور پیغام کو مسخ کرنے کے برابر ہیں۔ کیونکہ ان عظیم اور برگزیدہ ہستیوں کی یاد منانے کا بہترین طریقہ تو یہ ہونا چاہئے کہ اس دن تعلیمی اداروں میں اُن شخصیتوں کے کارناموں پر مذاکرے اور جلسے ہوں، تقریبات ہوں اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمی سرگرمیوں کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ کیونکہ ان شخصیتوں کی روح کو خوش رکھنے کا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا یہی طریقہ بامقصد اور مفید ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری درس گاہوں کے تعلیمی سال پہلے ہی تاخیر کا شکار ہیں۔ ان چھٹیوں کی وجہ سے اس تاخیر میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔۔۔ بلکہ اگر ان ساری چھٹیوں کا حساب لگایا جائے۔ جو ایک طالب علم کی پوری زندگی میں ہوتی ہیں تو اس نقصان کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اگر ملک کے تمام طلبا کی کُل چھٹیوں کو جوڑا جائے تو پتا چلے گا کہ ہماری نئی نسل تعلیمی میدان میں ہر سال کتنا پیچھے چلی جاتی ہے۔ یہ بڑی تشویشناک صورتِ حال ہے جس پر ابھی تک غور نہیں کیا گیا ہے کیونکہ چھٹیاں ہماری قومی کمزوری ہیں۔ چھٹی کا لفظ سُن کر ہم خوشی سے تالیاں بجانے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ان چھٹیوں کی مستقبل میں ہمیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

ہم توقع کرتے ہیں کہ حکومت اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کرے گی اور ہمارے طلبا میں کام چوری کے مقابلے میں کام کرنے کا رجحان پروان چڑھانے کے لیے ان چھٹیوں کی تعداد کو کم کرنے کا اعلان کرے گی۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

سیّد شاهد حسین شاہ، شیخوپورہ ۔ بھائی جان! کیا آپ کو علم ہے کہ ایسے کتنے طالب علم ہیں جو قیمت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے آپ کا رسالہ نہیں خرید سکیں گے۔ کیا آپ نے کبھی ایسا سروے کیا ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ کتنے غریب طالبِ علم آپ کا رسالہ پڑھتے ہیں۔ آپ کراچی میں بیٹھ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ پاکستان کے شہروں اور قصبوں میں رہنے والے غریب طالبِ علم کس طرح تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ کا رسالہ آہستہ آہستہ ایک مخصوص طبقے کے لئے رہ جائے گا اور وہ طبقہ امیر طبقہ ہوگا۔

● — رسالے کی قیمت کن مجبوریوں کی وجہ سے بڑھائی گئی۔ اس کی وضاحت ہم پچھلے کئی شماروں میں کر چکے ہیں۔ آپ نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اُن کا ہمیں احساس تھا لیکن زندگی میں ایسے فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں جو خود فیصلہ کرنے والے کو ناپسند ہوں۔ جو بچّے اسے خرید نہیں سکتے اگر ان میں شوق ہوگا تو وہ رسالہ کہیں نہ کہیں سے حاصل کر کے پڑھ ہی لیں گے۔ مثلاً کسی لائبریری سے، کسی دوست وغیرہ سے۔ ویسے ہمیں اپنے غریب ساتھیوں کا خود خیال رہتا ہے۔ یہ اسکالرشپ کی اسکیم ایسے ہی بچّوں کے لئے ہے۔

شبانہ شفیع، لیّہ ۔ اگست کے شمارے میں صفحہ ۸۵ سے ۱۰۲ تک صفحات کی ترتیب ٹھیک نہیں تھی۔ اپنے بُک بائینڈر سے کہیے کہ وہ جلدی میں صفحات کو اُلٹ پلٹ نہ کیا کرے۔ کیا قلمی دوستی میں اسکولوں کی لڑکیاں بھی حصّہ لے سکتی ہیں؟

● — اتّفاق سے کسی ایک کاپی میں یہ غلطی ہو گئی ہوگی۔ جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ بائینڈر کو احتیاط کرنے

ڈاکیہ ڈاک لایا

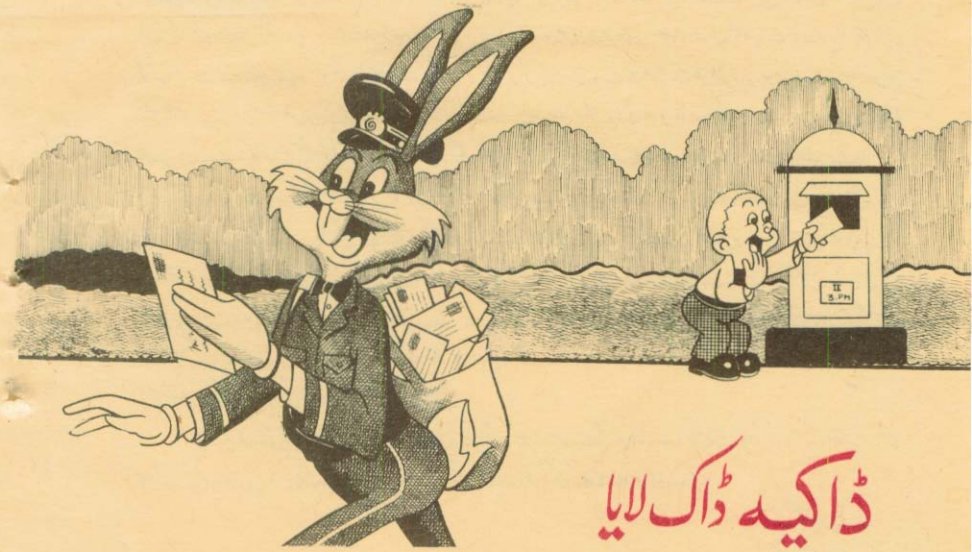

کی ہدایت کر دی گئی ہے۔ قلمی دوستی میں صرف لڑکوں ہی کے نام پتے اور تصویر چھپ سکتی ہے۔

صوفیہ بھٹی۔ ڈرگ روڈ، کراچی۔ قہقہہ نمبر میں میری کہانی "ایک تھا بادشاہ" شائع ہوئی تھی۔ اس پر میرا نام غلطی سے صوفیہ بٹ چھپ گیا تھا۔ جبکہ میرا نام صوفیہ بھٹی ہے۔ براہِ مہربانی اس غلطی کو درست کر دیجیے۔

● آپ نے کہانی پر اپنا نام انگریزی میں لکھا تھا اور اس طرح لکھا تھا کہ "بھٹی" "بٹ" پڑھا جا رہا تھا۔ غلطی آپ ہی کی ہے۔ جب کہانی اُردو میں لکھی تھی تو اپنا نام انگریزی میں لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ آپ کو پتہ ہے کہ ہماری انگریزی پہلے ہی بہت کمزور ہے۔

آصف علی راجہ بلوچ۔ گوادر مکران۔ بلیک بکس پسند آیا۔ اسی طرح نقل کرنے والوں کو آئندہ بھی یاد رہے گا کہ ہمیں نقل کرنے کی کیا سزا ملی تھی۔

● جی ہاں ... اور دوسروں کو بھی عبرت ہوگی۔ دیکھئے نا نقل کرنا تو ویسے بھی بُری بات ہے۔ کیونکہ نقل تو بندر کرتے ہیں۔

محمد یونس، جیکب لائن کراچی۔ انکل ایک بات بتائیں کہ رنگین صفحات کی معلومات آپ کہاں سے لاتے ہیں؟ جواب ضرور دیجئے گا۔

● بھئی یہ تو "بزنس سیکرٹ" یعنی تجارتی راز ہے۔ آپ کو آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے۔ پیڑ گننے کا کام آپ ہم پر چھوڑ دیجیے۔

فریحہ مبارک۔ کراچی۔ یہ بتائیے کہ ایک تحریر کتنے عرصے میں رسالے کی زینت بنتی ہے اور کتنے عرصے بعد یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری تحریر ردی کی ٹوکری نے ہضم کر لی۔

نائلہ بختیار، کوہاٹ۔ آپ کہتے ہیں کہ اپنی تحریروں کے متعلق اگر پوچھنا ہو تو جوابی لفافہ بھی ارسال کیا کریں مگر ہم تو جوابی لفافے بھیج کر عاجز آ گئے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا اپنی تحریروں کے بارے میں۔

● فریحہ اور نائلہ بہن! یہ دو سوال نہیں دو اعتراضات ہیں۔ اور ماشاءاللہ سے بڑے چبھتے ہوئے اعتراضات ہیں۔ لیکن ہم بُرا نہیں مانیں گے کیونکہ ہزاروں خطوط اور مسوّدات کے ہجوم میں کبھی کبھار ایسی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اچھی تحریریں تو شائع ہو ہی جاتی ہیں اور کوئی معقول بات پوچھی گئی ہو تو جوابی لفافے سے جواب ضرور بھیج دیا جاتا ہے۔

ستارہ شکور پراچہ، نوشہرہ۔ لطیفوں کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ صفحات ردی قسم کے ہیں۔ رنگین صفحات پر ٹرخایا جا رہا ہے لیکن وہ بھی بے حد بُرے لگے۔ آنکھ مچولی کی سج دھج بالکل ویسی نہیں رہی جیسی پہلے تھی۔ آپ جلد اس پر غور فرمائیں۔ ورنہ ہم بھوک ہڑتال کر دیں گے۔

● آپ کا خط پڑھنے کے بعد ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں۔ دن رات محنت کر کے رسالے کا معیار بہتر بنایا گیا ہے اور آپ کچھ اور ہی کہہ رہی ہیں۔ بہرحال کوشش کریں گے کہ رسالہ آپ کی امیدوں پر پورا اُترے۔

ارشد علی، اٹک۔ اسکالرشپ دینے کی جو روایت آپ نے ڈالی ہے وہ بہت اچھی ہے۔ اس سے غریب طلبا کو

اپنی تعلیم جاری رکھنے میں مدد ملے گی۔ شرائط میں آپ نے صداقت نامہ مانگا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ صداقت نامہ قرعہ اندازی سے پہلے بھیجا جائے یا بعد میں۔

● — ہم اچھی روایتیں قائم کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ صداقت نامہ صرف ان طلبا کو بھیجوانا ہے جن کا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا ہو۔

علی ایاز، لاہور کینٹ :۔ ایڈیٹر انکل! ستمبر کے رسالے میں جو لطیفہ ناصر خان نے سکھر سے بھیجا ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ لطیفہ نقل شدہ ہے اور اخبار میں دو مرتبہ چھپ چکا ہے۔

● — علی بیٹے! تمہارا بہت بہت شکریہ۔ لطیفے نقل کرنے کی اجازت ہم نے دے رکھی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ لطیفے نئے ہوں اور کسی بہت پرانے اخبار یا رسالے سے لئے گئے ہوں۔ کیونکہ دیکھو نا! لطیفہ آدمی خود تو نہیں بنا سکتا نا۔

منیر احمد فاضل، لاہور :۔ آپ کو میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی تجویز دیتا رہتا ہوں۔ مگر آپ نے کسی تجویز پر غور نہیں فرمایا۔ ایک بار پھر آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ آنکھ مچولی میں ایک صفحہ مصوری کے لئے وقف کر دیں۔

● — آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ ہم آپ کی تجویز پر غور نہیں کرتے اگر غور نہ کرتے تو تجاویز پر عملدرآمد ہو چکا ہوتا اب دیکھئے آپ کی تجویز پر مصوری والا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔

عامر خان مامون، راولپنڈی :۔ آنکھ مچولی میں پہلے اعلیٰ قسم کے رنگین صفحے شائع ہوتے تھے۔ وہ بند کیوں ہو گئے۔ اس کی وجہ سے تو رسالہ منفرد تھا مہربانی فرما کر اس قسم کے رنگین صفحے دوبارہ شامل کر دیں چاہے اس کے لئے آپ کو رسالے کی قیمت ہی کیوں نہ بڑھانی پڑے۔ دوسرے کوپن بہت زیادہ ہو گئے ہیں جنہیں کاٹنے سے رسالہ بدنما نظر آتا ہے۔

● — جس کاغذ پر پہلے رنگین صفحات شائع کیے جاتے تھے۔ اگر انہیں اب استعمال کیا جائے گا تو رسالہ بہت مہنگا ہو جائے گا۔ قیمت بڑھانے پر پہلے ہی ہمارے بہت سے ساتھی ناراض ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی ناراضگی ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ کوپن والی بات قابلِ غور ہے۔

قرۃ العین، کراچی :۔ آپ اپنے رسالے میں کسی مشہور شخصیت کا تعارف شائع کیا کریں۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالسلام، عبدالستار ایدھی، عمران خان وغیرہ۔ ان لوگوں سے ان کے بچپن کی عادتوں پر مضامین لکھوا کر شائع کرائیے۔ اسی طرح بچوں میں بھی محنت کا جذبہ بڑھے گا۔ اور ان شخصیتوں کی نصیحتیں ان کے کام آئیں گی۔

● — مشہور شخصیتوں کے متعلق مضامین اور انٹرویو اکثر چھپتے رہتے ہیں چونکہ مشہور شخصیتیں بہت مشہور ہوتی ہیں اس لیے وہ مصروف بھی بہت ہوتی ہیں اور بچوں کے لئے لکھنے لکھانے کا وقت ان کے پاس نہیں ہوتا۔ ویسے آپ کی تجویز اچھی ہے۔

یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔

ذیل میں ایسے خطوط درج کئے جارہے ہیں جن کو بھیجنے کے لئے ایک روپے کا لفافہ خرچ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ذرا سی کوشش اور توجّہ سے ان کے جوابات آسانی سے معلوم کئے جاسکتے تھے۔ یہ خطوط اس لئے شائع کئے جارہے ہیں تاکہ دوسرے ساتھی ایسی باتیں پوچھ کر اپنا لفافہ اور وقت ضائع نہ کیا کریں۔

محمد مشتاق، واہ کینٹ :- انکل! یہ میرا تیسرا خط ہے۔ میں نے ایک کہانی لکھی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ میں یہ کہانی کس پتے پر ارسال کروں؟ خط کا جواب ضرور دیجیے گا۔

قرۃ العین، حیدرآباد :- انکل! میں نے پہلے بھی خط لکھ کر آپ سے پوچھا تھا کہ رسالہ کب نکلتا ہے؟ میں نے آپ سے اگست کا رسالہ بھی منگوایا تھا۔ آپ نے رسالہ تو بھیج دیا لیکن میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ مجھے بہت دُکھ ہوا کہ آپ نے قیمت تو دس روپے کردی لیکن خطوط کے صفحات نہیں بڑھائے

شیخ ابرار حسین، شیخ راحت حسین، شیخ فرحان حسین۔ اٹک :- ہم تینوں بھائی اپنی جیب خرچ جمع کرکے آنکھ مچولی خریدتے ہیں۔ اگر آپ نے ہمارا خط شائع نہ کیا تو ہوشیار رہیں، ہم آپ کی ردّی کی ٹوکری چرانے آئیں گے۔ اگر ہمارا خط شائع ہوگیا تو آپ سے وعدہ ہے کہ ہم خوشی سے بیہوش ہو جائیں گے۔ ایک سوال، آپ کی مونچھوں میں کتنے بال ہیں؟

قیصر محمود، لطیف آباد، حیدرآباد :- میں آپ کے رسالے میں لکھنا چاہتا ہوں لیکن برائے مہربانی ان سوالات کے جوابات جلدی دیجئے۔

۱۔ لکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر ماہ ایک ہی چیز بھیجے۔ مثلاً ہر ماہ کہانی یا ہر ماہ صرف مضمون۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ایک ماہ کہانی بھیجے تو دوسرے ماہ مضمون وغیرہ۔

۲۔ کہانیاں یا مضامین ضروری ہے خود ہی لکھیں یا کسی پرانے رسالے سے چھانٹ کر نہیں بھیج سکتے...

۳۔ کیا ہر ماہ معاوضہ بھی ملا کرے گا۔ اگر ملے گا تو کتنا؟ اگر کم یا زیادہ چیزیں بھیجیں تو معاوضہ کم یا زیادہ ملے گا یا وہی جو مخصوص ہے؟

میں ساز بجاتی ہوں سکھ کا ۔ تم گیت امن کے گاؤ!

بچوں کے عالمی دن پر امن کی پری کا پیغام

امن کی پری کا پیغام

بچّوں کے عالمی دن کے موقع پر

مَیں پری ہوں
امن اور سکون کی
میرے ہاتھوں میں سازینہ ہے
جس پر میں اُمید بھرے گیت گاتی ہوں
کیا تم نے میرے گیتوں کے بول سُنے ہیں ؟
میں دوست ہوں
اُن سب بچّوں کی جن کی گلیاں کرفیو میں سنسان ہو جاتی ہیں
جن کے بھائی اور باپ چاقو اور گولی لگنے سے مَر جاتے ہیں
میں ان بے آسرا بچّوں کی دوست ہوں
جنھیں پیار بھری نگاہ سے کوئی نہیں دیکھتا
جو روتے روتے مٹّی پر سو جاتے ہیں
میں ساتھی ہوں
ان بچّوں کی جو پھول بیچتے ہیں، گاڑیاں صاف کرتے ہیں
گیراج میں "اُستاد" کی جھڑکیاں اور گالیاں سنتے ہیں
جو روتے بھی نہیں
راتوں کو میٹھی نیند سوتے بھی نہیں
جن کے پاس کتابیں، کاغذ اور قلم نہیں ہوتا
جُوتے بھی نہیں ہوتے، اسکول یونیفارم بھی نہیں ہوتا
جن کے کچّے گھر سیلاب میں بہہ جاتے ہیں
جو گندگی کے ڈھیر میں ٹوٹے ہوئے کھلونے ڈھونڈتے ہیں
باسی روٹیاں، پُرانے برتن اور بے کار چیزیں جمع کرتے ہیں
میں پری ہوں
میرے دوستو!
میں اپنے سازینے پر ہمیشہ تمہارے لئے گیت گاتی رہوں گی
محبّت اور اُمید کے گیت
خوشی اور خوشحالی کے گیت
ان بچّوں کے لئے گیت
جو پارکوں میں کھیلتے ہیں
صاف ستھرے رہتے ہیں
کتابوں میں دل لگاتے ہیں
بڑوں کا کہا مانتے ہیں
جن کی نظریں بلند رہتی ہیں
جو کبھی حوصلہ نہیں ہارتے

آؤ

ایک راز کی بات سنو
جو بچّے اچھے اور سچّے ہوتے ہیں
میں اُن کے خوابوں میں آتی ہوں
اُن سے پیار کرتی ہوں
میں اُن سب کی دوست ہوں
جو بچّوں کے دوست ہیں

رنگ بھریں تصویر بنائیں

اس محدب عدسے کو غور سے دیکھئے اس میں نظر آنے والی آڑی ترچھی لکیروں میں کچھ چھُپا ہے۔ آپ نقطوں والے خانوں میں رنگ بھریئے۔ چھُپی ہوئی چیز اُبھر کر سامنے آئے گی۔

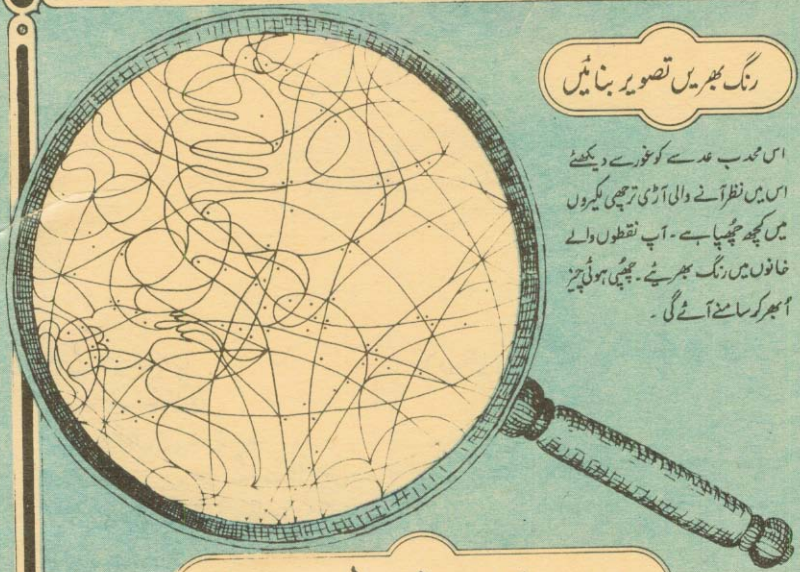

ذہانت شرطیہ

تیتر کے دو آگے تیتر تیتر کے دو پیچھے تیتر
آگے تیتر پیچھے تیتر بولو تو کُل کتنے تیتر

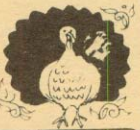

منظر مکمّل کیجئے

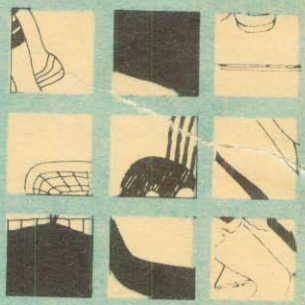

فرشی ہاکی سے دلچسپی رکھنے والے تیار ہو جائیں اور نیچے دیئے ہوئے منظر کو غور سے دیکھیں. اس منظر سے نو مربع فرار ہو کر اوپر چلے گئے ہیں ۔ آپ انہیں گرفتار کر کے انہیں اُن کی جگہوں پر فٹ کر دیں۔ اگر آپ نے سب ٹکڑوں کو درست مقامات پر فٹ کر دیا تو سمجھیں کہ آپ نے اپنی ٹیم کے لیے ایک گول کر دیا۔

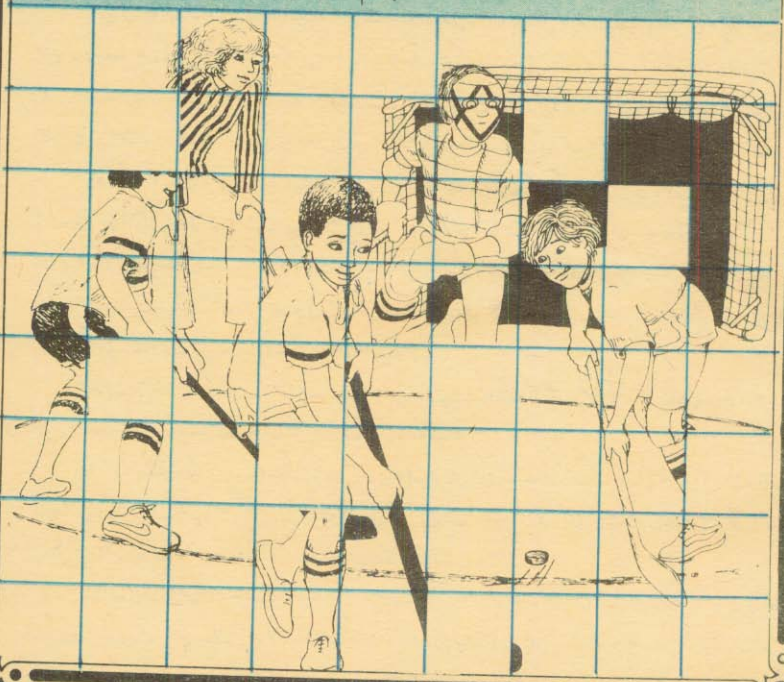

میم سے مینڈک

اُمِّ رمیصاء

جب کوئی شخص بول رہا ہو بے مقصد ہانک رہا ہو تو عموماً سننے والا چڑ کر یہ کہتا ہے "کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے"۔ یا یہ کہ ... تم اپنی ٹرٹر بند کیوں نہیں کرتے"۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ یہ "ٹرٹر" کیا چیز ہے؟ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ آپ اگر رات کے وقت کسی ندی، نالے، نہر یا جھیل وغیرہ کے قریب سے گزریں تو آپ کو ٹرٹر کی آوازیں سنائی دیں گی۔۔ جو لمحے بھر کے لئے بند ہو بھی جائیں تو پھر سے شروع ہو جائیں گی اور ایسا لگے گا جیسے اس علاقے میں کوئی مقابلۂ ٹرٹراہٹ ہو رہا ہو۔ یہ آوازیں مینڈکوں کی ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مینڈک کی اس مسلسل آواز کو ٹرٹرانا کہتے ہیں۔

مینڈک بھی بڑی عجیب چیز ہے اس کا نام سنتے ہی نہ جانے کیوں ایک گدگدی کا سا احساس ہوتا ہے ... ہم اگر کسی کو مینڈک کہہ دیں تو وہ اس کا بڑا بُرا مناتا ہے۔ حالانکہ بُرا تو مینڈک کو منانا چاہیئے ... مینڈک کا نام خواہ مزاحیہ سا سہی مگر مینڈک خود بڑا مظلوم جانور ہے۔

کالج کی ابتدائی کلاسوں کے طلبا اپنے تجربات کے لئے ہمیشہ مینڈک ہی کو پکڑتے ہیں اور اس کو چیر پھاڑ کر برابر کر دیتے ہیں گویا مستقبل کے سرجن پہلا آپریشن مینڈک ہی کا کرتے ہیں خواہ مینڈک کو آپریشن کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ ہم نے سوچا کہ اس بار کیوں نہ آپ کو مینڈک کے متعلق ایسی معلومات فراہم کی جائیں جسے پڑھ کر نہ صرف آپ کی معلومات میں اضافہ ہو بلکہ مینڈکوں کی بھی حوصلہ افزائی ہو اور معاشرے میں ان کی عزت بحال ہو جائے۔

مینڈک کا شمار ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں ہوتا ہے۔ مینڈک کو انگریزی میں Amphibians بھی کہتے ہیں Amphi کا مطلب ہے دوہری اور Bians کے معنی ہیں زندگی ... یونانی زبان کے یہ دو الفاظ مل کر ایک لفظ بن گئے۔ اس کا مطلب ہے دوہری زندگی والا۔ یعنی یہ خشکی میں بھی رہ سکتا اور پانی میں بھی ... مینڈکی انڈے دیتی ہے مگر خشکی میں نہیں پانی میں اُس کے بچوں کی شکلیں اس سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ بچوں کی دمیں اور گلپھڑے ہوتے ہیں جو بڑا ہونے پر جھڑ جاتے ہیں۔

مینڈک پھیپھڑوں اور کھال کے مسامات سے سانس لیتا ہے۔ مینڈک کی ایک قسم Toad کہلاتی ہے، اس کے جسم پر دانے سے پڑے ہوتے ہیں اور یہ بہت بھدا ہوتا ہے۔

ٹوڈ عموماً چلنے کے بجائے رینگتا ہے اور یہ زہریلا بھی ہو سکتا ہے۔ مینڈک کو تل تھلیا بھی کہتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ جب خوب جل تھل ہوتی ہے یعنی بارش کے دن آتے ہیں تو یہ بھی اپنے بلوں سے باہر نکل آتا ہے ... بلکہ "برساتی مینڈک" تو اُردو زبان کا محاورہ بن چکا ہے۔

مینڈک کی غذا مکھیاں، کیڑے مکوڑے اور کینچوے ہیں۔ اس کی زبان لمبی ہوتی ہے اور زبان کی نوک پر چپکنے والی خاصیت ہوتی ہے۔ اسی لئے شکار کو جلدی اور آسانی سے دبوچ لیتے ہیں پھر اپنے اوپر والے مسوڑھے میں موجود انتہائی باریک دانتوں سے چبا کر کھا لیتا ہے... ٹوڈ کے منہ میں البتہ دانت نہیں ہوتے ... دُنیا میں مینڈک کی بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان صفحات میں ہم آپ کو نہ صرف رنگ برنگے اور عجیب و غریب مینڈکوں سے ملوا رہے ہیں بلکہ ان کی خوبیاں بھی آپ کو بتا رہے ہیں۔

مینڈک کم و بیش پوری دنیا ہی میں پائے جاتے ہیں۔۔۔
انٹارکٹیکا کے علاوہ دنیا کا شاید ہی کوئی بڑا خطہ ایسا ہو جہاں مینڈک نہ ہوتے ہوں۔ مختلف علاقوں اور خطّوں میں مختلف اقسام اور خصوصیات کے مینڈک پائے جاتے ہیں۔ کوئی گورا کوئی کالا، کوئی ہرا اور کوئی لال پیلا۔ اس طرح کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا، کوئی خوبصورت اور کوئی انتہائی بھدّا، مگر بنیادی طور پر یہ سب مینڈک ہی کہلاتے ہیں۔ ماہرینِ حیوانیات کا کہنا یہ ہے کہ دنیا بھر میں مینڈک کی تین ہزار چھ سو اقسام موجود ہیں۔

پتھر کا بنا ہُوا ایک خوبصورت مینڈک اور مینڈک کے منہ سے جھانکتا ہُوا ایک شرارتی بچّہ

جو جنگلوں میں، دلدلوں اور صحراؤں میں اور رُکے ہوئے پانی کے کناروں پر پائی جاتی ہیں، ماہرینِ مینڈکیات کا یہ بھی کہنا ہے کہ دنیا کے مختلف خطّوں کی آب و ہوا کے فرق، موسموں کی تبدیلی، دو مختلف اقسام کے مینڈکوں کے ملاپ اور زندگی کے طویل ارتقائی سفر نے مینڈکوں کو بے شمار نسلوں میں تقسیم کر دیا ہے ورنہ ہیں سب کے سب وہی مینڈک۔ پھدکتے رہنا، ٹرٹراتے رہنا اور کیڑے مکوڑے کھاتے رہنا... عادتاً سبھی مینڈک ایک دوسرے سے بڑی حد تک مشابہ ہوتے ہیں... مینڈک کا نام بلکہ خود مینڈک بھی بچّوں کو بہت پسند ہے۔ غالباً اسی لئے بچّوں کی کہانیوں، کرداروں اور تفریحی جگہوں پر مینڈک کا ذکر بہت ملتا ہے۔ بچّے بھی مینڈک کی طرح پھدک کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ دنیا کے مشہور پارکس میں چلے جائیے۔ پتھر کے بڑے بڑے مینڈک رکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ پپٹ شو دیکھ لیجئے۔ مینڈک کا کردار ضرور ہوگا۔ بلکہ اب تو یورپ اور امریکہ میں ہر سال مینڈک ریس بھی باقاعدگی سے ہوتی ہے، کچھ عرصہ قبل پاکستان ٹیلی ویژن کے خبرنامے میں بھی مینڈکوں کی دوڑ کا ایک دلچسپ مقابلہ دکھایا گیا تھا۔ ممکن ہے آپ نے بھی

دیکھا ہو۔ ایک بات طے ہے کہ مینڈک
صرف بچّوں کی تفریح کے لئے تخلیق نہیں کئے گئے
بلکہ اس کے بہت سے فوائد بھی ہیں۔ یہ زہریلے کیڑے مکوڑوں
کو کھاتا ہے اور اسی غذائی دائرے کا ایک حصہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ
نے تمام جانداروں کے لئے وضع کیا ہے۔ مینڈکوں پر تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔
آیئے چند ایسے مینڈکوں سے ملیں جو آج کل
تحقیق کا موضوع بنے ہوئے ہیں

یہ مینڈک
جنوبی امریکہ کے برساتی جنگلوں
میں رہتا ہے۔ ایک لمحے کو بھی چین سے
نہیں بیٹھتا۔ پھدکتا رہتا ہے۔ درختوں کی ٹہنیوں
سے لٹک کر کرتب دکھاتے رہنا اس کا مشغلہ
ہے۔ اس کی ٹانگیں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ جن
کی بدولت یہ طرح طرح کے کھیل تماشے کرتا ہے۔ اس کے پیروں
میں خاص قسم کی چپکنے والی خوبی ہوتی ہے۔ شکار کی تلاش میں درخت
کی بلندی تک چلا جاتا ہے۔ اور بہ آسانی شکار کو دبوچ لیتا ہے۔ سرکس
والوں کی نظر اب تک اس مینڈک پر نہیں پڑی۔ ورنہ بعید نہ تھا کہ وہ مینڈکوں کی
اس نسل کو پکڑ کر لے جاتے اور گلی گلی مینڈکوں کا تماشہ دکھا کر پیسہ کماتے۔

بظاہر ایسا لگ رہا ہے جیسے درخت کی ٹہنی پر ایک قطار میں بیٹھے ہوئے یہ مینڈک گروپ فوٹو کھنچوا رہے ہیں، مگر دراصل ایسا نہیں ہے... چھوٹے چھوٹے سے یہ مینڈک وسطی امریکہ اور میکسیکو کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان مینڈکوں کی آنکھیں غصّے سے سُرخ نہیں ہو رہیں بلکہ فطری طور پر ان کا رنگ سُرخ ہے۔ ان بڑی اور سُرخ آنکھوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عام مینڈکوں کے مقابلے میں زیادہ روشنی سما جاتی ہے اسی لیے یہ رات کے اندھیرے میں بھی نسبتاً واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ درخت کی لچک دار ٹہنیوں پر بیٹھ کر جھولنے میں انہیں بڑا مزہ آتا ہے۔

غیر معمولی جسامت اور پھٹی ہوئی آنکھوں والا یہ مینڈک بھی امریکی ہے۔ اسے عموماً "بُل فراگ" یا بیل مینڈک کہا جاتا ہے۔ آپ اسے مینڈکوں کا پہلوان بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ صرف کیڑے مکوڑے ہی نہیں۔ بلکہ اکثر چھوٹے مینڈک اور پرندوں تک کو ہڑپ کر جاتا ہے۔

وسطی اور جنوبی امریکہ میں پایا جانے والا یہ مینڈک ایسا لگتا ہے جیسے شیشے کا بنا ہُوا ہو۔ کیونکہ آپ اس کے جسم کے آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ اللہ نے اسے اپنی حفاظت کے لئے اتنا شعور دیا ہے کہ یہ اپنے ہم رنگ پتوں میں چھُپ کر دشمن کی نظر کو دھوکہ دے دیتا ہے۔

آپ سمجھ رہے
ہوں گے کہ شاید یہ مینڈک
چیونگ گم کے ببل بنا رہا ہے ۔ ہرگز
نہیں ۔۔۔ سچ یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں پائے
جانے والے اس مینڈک کے منہ کے اطراف ایسی
تھیلیاں موجود ہوتی ہیں جن میں پہلے وہ ہوا بھرتا
ہے ۔ پھر اسی ہوا سے
مخصوص آوازیں نکالتا ہے۔ یہ
آوازیں دشمنوں کو دُور رکھنے
میں مدد دیتی ہیں ۔ اور
میل بھر تک سُنی
جاسکتی ہیں۔

لمبی چونچ
کی طرح کے منہ
والا یہ مینڈک میکسیکو میں پایا جاتا
ہے ۔ یہ بلوں میں رہتا ہے ۔ مٹی کے بلوں
میں اس کی موجودگی نمی پیدا کر دیتی ہے ۔

مینڈک کی یہ بھدی اور بھیانک قسم ملائشیا کے
بعض حصّوں میں پائی جاتی ہے ۔ اس
کا رنگ درختوں سے جھڑے ہوئے زرد
یا سُوکھے ہوئے بھُورے پتّوں کی طرح
ہوتا ہے ۔ چونکہ اکثر ایسے ہی پتّوں میں رہتا
ہے ۔ اسی لئے دوسرے جانور اسے
آسانی سے نہیں دیکھ پاتے ۔

"ڈھاڑیل"
بہ معنی
"ڈاکو"

سلسلے وار ناول
قسط نمبر ۲

ڈاڑیل

نعیم بلوچ

سندھ کے پس منظر میں لکھا گیا ایک پُر تجسس سلسلۂ تحریر

اٹھارہ سالہ جانو کو اپنی بیمار ماں کے علاج کے لئے وڈیرے سے رقم نہ مل سکی۔ گوٹھ کے ایک ہندو بیوپاری رام چند نے اُس کو ماں کے علاج کے لئے رقم بھی دی اور اُسے ملازمت دلانے کے لئے اپنی اوطاق پر بُلایا جانو جب وہاں پہنچا تو اُس نے تین افراد اور اپنے ہم عمر لڑکے منظور کو پہلے سے موجود پایا۔ تھوڑی دیر بعد جانو اور منظور کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد جیپ کسی نامعلوم جگہ کی طرف روانہ ہوگئی۔ اُنھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ ایک پہاڑی غار میں پہنچا دیئے گئے۔ یہاں اُنھیں ڈکیتی کے لئے تیار ہونا پڑا۔ چند روز بعد اُنھوں نے رات کے تین بجے مرکزی شاہراہ پر مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس کو رکاوٹیں کھڑی کر کے روک لیا۔ بس میں موجود پولیس کے دو مسلح سپاہی اور مسافر چونک پڑے۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

بس کے تمام مسافروں میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ ڈرائیور نے بڑی مہارت سے گاڑی کو بیک کیا۔ لیکن جیسے ہی اُس نے گاڑی کو دوسرے گیئر میں ڈالا۔ سامنے سڑک پر اُسے کئی ایک آدمی دکھائی دیئے ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ دوسرے ہی لمحے کئی ایک گولیاں بس کے سامنے کے شیشے کے اوپر والے حصّے میں لگیں۔ ڈرائیور جانتا تھا کہ اگر اب بھی اُس نے بس کو نہ روکا تو اگلی گولیوں کا نشانہ وہ خود ہوگا۔

جونہی بس رُکی، فائرنگ کرنے والوں نے بس کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا۔ اور پھر چند منٹوں کے بعد تین ڈاکو بس میں داخل ہوئے۔ کنڈیکٹر نے ان کے لئے دروازہ پہلے ہی کھول دیا تھا۔ اُنھیں دیکھ کر پولیس کے سپاہیوں نے اپنی بندوقیں نیچے پھینک دیں۔ تینوں ڈاکوؤں نے اندر گھُس کر بس کا جائزہ لیا اور پھر ایک نے بلند آواز سے کچھ کہا۔ اور مزید چار ڈاکو بس میں داخل ہو گئے۔ ان تمام ڈاکوؤں نے اپنے چہرے پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ کوئی بھی انھیں نہیں پہچان سکتا تھا۔ ان میں دو نئے ڈاکو بھی شامل تھے۔ ایک جانو دوسرا منظور ...

"تم سب لوگ اپنا سامان روپیہ پیسہ چُپ چاپ باہر نکال دو۔ تلاشی لینے پر کوئی چیز مل گئی تو اُسے گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔" لمبے قد والا ڈاکو غرّایا۔

مسافروں نے مارے ڈر کے اپنی اپنی چیزیں باہر نکالنی شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد مسافروں کی تلاشی شروع ہوگئی۔ چار ڈاکو اس کام میں مصروف ہو گئے۔ بس کے اگلے اور پچھلے حصّے، دونوں طرف سے تلاشی لی جا رہی تھی، لیکن برآمد کیا ہونا تھا۔ کسی نے بھی کوئی چیز نہیں چھپائی تھی۔ ہر ایک نے پہلے سے ہی اپنا مال و اسباب باہر نکال کر رکھا ہوا تھا۔ نقدی، گھڑیاں، عورتوں کے زیورات ... بس یہی چیزیں لی جا رہی تھیں۔ تلاشی لینے والوں میں جانو اور منظور بھی شامل تھے۔

"میری بچّی کی شادی ہے سائیں۔ رسول پاک کی قسم یہ رقم ادھار لے کر آیا ہوں۔" یہ الفاظ جانو کے کانوں میں پڑے تو اُس کی نظریں خود بخود ایک دوسرے ڈاکو کی طرف اُٹھ گئیں جو ایک بوڑھے ہاری پر بندوق تانے کھڑا تھا۔ بوڑھے ہاری کی فریاد سُن کر ڈاکو نے اپنے سردار کی طرف دیکھا۔ سردار کی بندوق کا رُخ پہلے ڈرائیور کی طرف تھا، اب اُس کا نشانہ منّت کرنے والا بوڑھا تھا۔ اس کی بے رحم آواز ساری بس میں پھیل گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اگر کسی نے ہم سے رحم کے لئے کہا تو اس کا انجام بھی اس بڈھے کی طرح ہوگا۔"

اور اس کے بعد بندوق کی نالی سے ایک شعلہ نکلا اور وہ بدنصیب بوڑھا سینے پر ہاتھ رکھے، سیٹ سے دہرا ہو کر بس کے فرش پر گر پڑا۔ بوڑھا بالکل ساکت ہو چکا تھا، لیکن اس کے سینے سے خون ابھی بھی اُبل رہا تھا۔

بس میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

بوڑھے ہاری کے اس ظالمانہ قتل کو دیکھ کر جانو کے دل میں پہلی مرتبہ ڈاکوؤں کے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔ اس کے ذہن نے یہ کبھی نہ سوچا تھا اُسے اس طرح کے ظالمانہ کام میں بھی شریک ہونا پڑے گا۔ مسافروں سے چیزیں چھیننے کے بجائے وہ کھڑا ہو کر بوڑھے کی خون میں لت پت لاش دیکھ رہا تھا۔ ایک دم اس کے کانوں پر سردار کی آواز ہتھوڑے کی طرح لگی۔

"جانو... اپنا کام کرو۔"

جانو نے ایک جھرجھری لی۔ اُسے وہ تمام باتیں یاد آگئیں جو آج پہلے سبق کے طور پر ایک ڈاکو نے اُسے بتائی تھیں۔ اُسے ڈاکو کی آخری بات رہ رہ کر یاد آرہی تھی: "ہم سے علیحدہ ہونے کی سزا صرف تمہاری موت ہی نہیں بلکہ تمہارے پورے خاندان کی موت ہوگی۔" اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا... لیکن اس کی نفرت خوف میں دبی تھی، ختم نہیں ہوئی تھی۔

بوڑھے کے قتل کے بعد بس کے مسافر پوری طرح ڈاکوؤں کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک خاموشی سے مسافروں سے مال چھینا جاتا رہا۔ پھر بس کے درمیانی حصے میں ایک مسافر کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ اور پھر منظور کی آواز بس میں گونجنے لگی۔

"سردار یہ کچھ نہیں دیتا۔ کہتا ہے میں "سید" ہوں۔"

"فقیرو... اس کا شناختی کارڈ دیکھو۔ وہاں سید لکھا ہے تو چھوڑ دو۔ ورنہ اسے گولی مار دو اور مال چھین لو۔"

فقیرو نے آگے بڑھ کر اس آدمی کا شناختی کارڈ دیکھا۔ وہاں واقعی سید عابد علی لکھا ہوا تھا۔ اُس نے شناختی کارڈ واپس کیا اور اُسے سلام کرتے ہوئے بولا۔

"سید بادشاہ ہے سائیں۔"

جانو کو سردار کی اس رحم دلی پر سخت غصہ آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے سید ہونے میں اس کا کیا کمال ہے۔ اگر اس غریب بوڑھے کو چھوڑ دیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

پوری بس میں سے کسی اور نے سید ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ شناختی کارڈ کی شرط نہ ہوتی تو شاید سب ہی مسافر یہ ترکیب آزماتے۔

ایک غریب سی عورت خوف سے رو رہی تھی۔ تلاشی لینے والے ڈاکو نے اُسے ڈانٹتے ہوئے چپ رہنے کو کہا۔ اُس کی تلاشی لی گئی تو اُس سے صرف دس روپے ملے۔ ڈاکو نے غصے سے وہ دس روپے اپنے قبضے میں

لیتے ہوئے کہا۔

"روتو اس طرح رہی ہے جیسے لاکھوں کا نقصان ہُوا ہو۔"

جانو قریب ہی ایک دوسرے مسافر کے ساتھ مصروف تھا۔ اُس نے روتی ہوئی بُڑھیا کی طرف دیکھا تو اُس کی نظر اچانک اُس کے جوتوں پر پڑی۔ وہ بُڑھیا کی چالاکی پر بہت خوش ہوا۔ سو روپے کے نوٹ کا کونہ جُوتے کے تلوے میں نظر آ رہا تھا۔ بڑھیا نے نوٹوں کو جوتوں کے اندر پاؤں کے نیچے رکھا ہُوا تھا۔ ڈاکو نے اس کے جُوتے کی تلاشی نہیں لی تھی۔ جانو نے بُڑھیا کے جُوتے سے نظر ہٹائی اور اپنے کام میں لگ گیا۔ اس کو مسافروں سے ہمدردی اور ڈاکوؤں سے نفرت سی ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنے آپ کو پتا نہیں کیوں اس پورے عمل کے باوجود ڈاکو نہیں سمجھ رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد ڈاکو اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے لُوٹا ہُوا مال سنبھالا۔ بس کو اپنے سامنے روانہ کیا۔ اور پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

جانو کے دوست رام چند نے اِرد گرد کے علاقے کے بہت سارے لوگوں کو دعوت پر بلایا ہُوا تھا۔ کھانے کے بعد لوگ آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ اکثر لوگ رام چند کے اِرد گرد اکٹھے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"سُنا ہے حکومت سندھی زبان پر پابندی لگا رہی ہے۔" "اور یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ یونیورسٹیوں کالجوں اور حکومتی اداروں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ سندھیوں کو کم سے کم منتخب کیا جائے۔" رام چند کے ایک دوست کھوڑو بابا نے کہا۔

"بھئی میں تو کہتا ہوں کہ اس پاکستان پر اب سندھیوں کا کوئی حق نہیں رہا۔ جو حکمران بھی آتا ہے سندھیوں ہی کو مارتا ہے۔ مُلک کے دوسرے حصوں میں جا کر دیکھو۔ گاؤں گاؤں، اسکول کالج کھُلے ہیں، فیکٹریاں لگی ہیں۔ ہر گاؤں میں بجلی ہے۔ کوئی بے روزگاری نہیں، کوئی بھُوکا نہیں سوتا۔"

"بھُوکے کیسے سوئیں جمال ادا... یہاں سے سب کچھ تولے جاتے ہیں... ہم سندھیوں سے تو وہی سلوک ہو رہا ہے جو انگریز کرتا تھا... وہ سب کچھ لُوٹ کر اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور ہمیں اپنی غلامی پر مجبور کرنے کے لئے غربت اور محرومی دے دیتا تھا... آزادی کے بعد ہمارے ساتھ وہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ کچھ فرق نہیں ہے۔ پہلے غیر مُلکی آقا تھے۔ اب اپنے مُلک کے آقا ہیں۔ اگر فرق ہے تو اتنا کہ وہ سفید چمڑی والے تھے اور یہ ہمارے جیسے کالے۔ ایک پڑھا لکھا ہندو نوجوان بہت سلیقے اور مہارت سے گفتگو کر رہا تھا... ذرا سا رُک کر

اُس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"میری بات کا یقین نہیں آتا تو پچھلے چالیس سالوں کا ریکارڈ دیکھ لو۔ پچھلے دنوں لاہور کے ایک اخبار میں یہ چھپا تھا کہ تعلیمی اور صنعتی ترقی میں سندھ سب سے پیچھے ہے۔ اس لیے بھائیو... اگر سکھ چین کی زندگی چاہتے ہو تو تمہیں ان دیسی آقاؤں سے آزادی حاصل کرنا ہوگی۔ اپنے سندھ کو آزاد کرانا ہوگا۔ پھر جو چاہے کرنا... اپنا دیس ہوگا۔ اور اپنے لوگ ہوں گے۔ حق تمہیں مانگے سے نہیں ملے گا۔ اسے لینا چاہتے ہو تو چھین لو۔ غلامی کی زنجیریں توڑ دو۔ غربت کی اندھیری رات کو ختم کرنے کے لیے آزادی اور روشن خیالی کی شمع روشن کرنا ہوگی۔"

رام چند نے جذباتی انداز سے کہا۔

پھر ایک جوشیلے نوجوان نے نعرہ لگایا: "سندھو دیش"

تمام لوگوں نے مل کر جواب دیا: "زندہ باد" "رام چند" "زندہ باد" "سندھو دیش" "زندہ باد"

کافی دیر تک وہ لوگ اس طرح کے نعرے لگاتے رہے۔

یہ محفل ختم ہوئی تو جانو اور ڈاکوؤں کا سردار آگئے... جانو کو ڈاکوؤں کے ساتھ گئے تین دن ہو چکے تھے۔ اور آج وعدے کے مطابق سردار کو رام چند کے ہاں آنا تھا۔

"آؤ... آؤ... قادر خان... کہو کیسے ہو...؟ واہ بھئی... یہ تو ہمارا جانو بھی ساتھ ہے۔ کیسی خوبصورت لگ رہی ہے بندوق" رام چند نے ڈاکوؤں کے سردار اور جانو کو اپنے کندھے پر بندوق لٹکائے دیکھ کر کہا۔

سردار نے جانو کو رام چند کی بات کا جواب دینے کی بھی مہلت نہ دی اور کہا: "جاؤ جانو، گھر جاؤ۔ صبح یہیں آجانا۔"

جانو، رام چند سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ خود تو بہت رحم دل اور غریبوں کی مدد کرنے والا ہے لیکن اُس نے اُسے کیوں ظالم ڈاکوؤں کا ساتھی بنا دیا؟ وہ اتنا اچھا انسان ہو کر ڈاکوؤں سے کیوں ملتا ہے؟ لیکن سردار کا حکم ماننا ضروری تھا۔ وہ سلام کہہ کر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب اس کی ماں اور بہنوں کی تصویر تھی۔

جانو کے جانے کے بعد رام چند، سردار قادر خان کو ایک ایسے خفیہ کمرے میں لے گیا، جس کا دروازہ ایک الماری کے پیچھے تھا۔ رام چند کے علاوہ دو چار آدمی ہی ایسے ہوں گے، جن کو اس کا علم تھا۔ سردار قادر خان جب کمرے میں داخل ہوا تو حیرت کے مارے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُسے کمرے میں بے شمار اسلحہ نظر آیا۔ ایسا اسلحہ جو قادر خان نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسے حیران دیکھ کر رام چند نے کہا۔

"ہمارے دوستوں نے پیغام کے ساتھ یہ تحفہ بھی بھیجا ہے۔ انھوں نے مجھے کہا ہے کہ میں اپنے تمام دوستوں کو یہ بتادوں کہ اگر انھوں نے ہدایت کے مطابق کام جاری رکھا تو بھگوان کی کرپا سے دو سالوں میں سندھو دیش بن جائے گا۔ اور پھر وہ سندھو دیش تم جیسے دوستوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"یہ تو سائیں ایک خواب ہے جو کبھی پورا نہیں ہوگا۔ پاکستان کی فوج تمہیں ایسا کبھی نہیں کرنے دے گی۔"

"نہ، نہ قادر سائیں۔ ایسا کیوں کہتے ہو۔ بنگلہ دیش بھی تو پاکستانی فوج کے ہوتے ہوئے بنا ہے۔ اگر تم لوگ بھی اسی طرح ہمارا ساتھ دو جس طرح بنگالیوں نے دیا تھا تو تم دیکھنا پاکستانی فوج ایک دفعہ پھر کچھ نہ کر سکے گی۔"

"چلو چھوڑو اس بحث کو تم بتاؤ کام کیا ہے۔" قادر خان نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"عبدالحق کو اغوا کرلو۔"

"وہ جو مشہور پاکستان دوست لیڈر ہے۔ اس کو۔۔۔"

"ہاں۔ اسی عبدالحق کو اغوا کرو۔ پھر اُسے ہمارے سپرد کردو۔ ہم اس میں پاکستان کی محبت نکال دیں گے۔ پھر تمہیں واپس کر دیں گے۔ اور تم اُس کے وارثوں سے رقم لے کر اُسے چھوڑ دینا۔ اس کام کا تمہیں ایک لاکھ دیا جائے گا۔ ایک ضروری بات تم سے یہ بھی کہنی ہے کہ آئندہ سے تم میرے گھر نہ آیا کرو۔ میرا بندہ تمہیں خود ہی میرا پیغام پہنچا دیا کرے گا۔"

"کیا کوئی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مجھے ہدایت دی گئی ہے تم کسی ایسے آدمی سے نہ ملو، جو حکومتِ پاکستان کی نظر میں مجرم ہو۔ تاکہ پاکستانی فوج یا پولیس کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہ ہو جس سے وہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی کر سکیں۔ اور تمہیں بھی اب احتیاط کرنی چاہیے بے شک پولیس اور انتظامیہ میں ہمارے آدمی موجود ہیں لیکن پھر بھی پاکستانی فوج کا خطرہ ہر وقت موجود ہے۔ فوج کا گشت روز بروز تیز ہو رہا ہے۔ تم ہر اُس آدمی کو اغوا کر لو۔ یا گولی مار دو جو فوج کو کسی بھی ڈاکو کے متعلق کچھ بھی بتاتا ہے۔ اپنے قبیلے کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر رکھو تاکہ وہ ان لوگوں پر نظر رکھ سکیں جو انعام کی خاطر فوج کو ڈاکوؤں کے متعلق کچھ بتاتے ہیں۔"

قادر خان کو یہ باتیں پہلے سے ہی معلوم تھیں۔ رام چند اُسے ہر دفعہ ایسی ہی نصیحتیں کیا کرتا تھا، لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ قادر خان نے اس طرح سر ہلایا جیسے وفادار جانور دُم ہلاتا ہے اور پوچھا "سائیں عبدالحق کو کب اغوا کرنا ہے؟"

"آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد۔ یعنی ۲۵ تاریخ کو اخباروں میں عبدالحق کے اغوا کی خبر ہونی چاہیے۔ اس کے تین دن بعد میرا آدمی اُسے تم سے لے جائے گا۔"

"وہ آدمی کون ہوگا اور مجھ تک کیسے پہنچے گا؟"

"تم تک پہنچ جانا ہی اُس کی پہچان ہوگی... اور کیسے، کا مسئلہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

پھر کیا ہُوا---؟

یہ جاننے کے لیے آئندہ ماہ کے شمارے میں دھاڑیل کی سنسنی خیز قسط پڑھنا نہ بھولیے۔

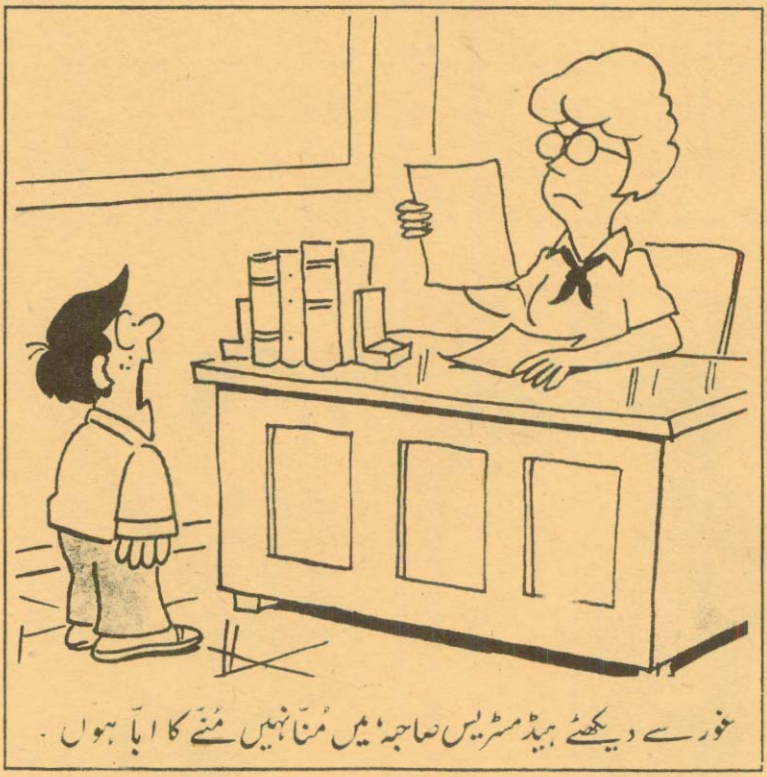

غور سے دیکھئے ہیڈ مسٹریس صاحبہ، میں مُنّا نہیں مُنّے کا ابّا ہوں۔

مقابلہ

کلثوم واحد

پاکستان کو زبیر جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے

ادریس ایک امیر خاندان کا لڑکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خود اسے بھی خدا نے اچھی صُورت، صحت اور ذہانت سے نوازا تھا مگر ماں باپ کے حد سے بڑھے ہوئے لاڈ پیار نے اس میں خود پسندی کے ساتھ ساتھ غُرور بھی پیدا کر دیا تھا اور اب وہ اس کے اظہار کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ گنواتا۔ اسکول میں عید ملن یا ایسے ہی کسی موقع پر اس کی کوشش ہوتی کہ وہ سب سے اعلیٰ لباس پہن کر جائے۔ کسی پارٹی کے موقع پر جب ہر بچّے سے کھانے پینے کی کوئی چیز منگائی جاتی تو وہ اس شان سے آتا کہ اس کے پیچھے تین چار نوکر پھل، مٹھائی، کیک اور بسکٹوں

سے لدے پھندے ہوتے۔ ہم جماعت تو خیر ایسے مظاہروں اور اس کی شاہ خرچی سے مرعوب تھے ہی اساتذہ کی اکثریت کو بھی اس نے قیمتی تحائف اور دعوتوں سے متاثر کر لیا تھا۔ یہ اسکول شہر کے بہترین اسکولوں میں شمار ہوتا تھا۔ فیس اور تعلیمی اخراجات بھی اس قدر زیادہ تھے کہ عام آدمی اس کا تصور بھی نہ کر پائے۔ تقریباً سب ہی بچے دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان میں سے بہت سے بچوں کے والدین ایسے بھی تھے جو نمائش پسند نہیں کرتے تھے اور جن کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد سادہ زندگی بسر کرنے کی عادی بنے، ایسے طالب علموں پر اپنی برتری اور شان و شوکت کا اظہار کر کر کے ادریس نے سب میں نمایاں اہمیت حاصل کر لی تھی وہ چونکہ تعلیمی میدان میں بھی کسی سے کم نہ تھا لہذا سبھی نے اپنی اپنی جگہ خاموشی سے اس کی بڑائی تسلیم کر لی تھی۔

نئی جماعت کا پہلا دن ادریس کے لئے بڑا تعجب خیز ثابت ہوا، جب اس نے اپنے برابر مالی کے بیٹے زبیر کو بیٹھے دیکھا پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ بھلا کہاں یہ اتنا مہنگا اسکول اور کہاں ایک غریب مزدور کا بیٹا۔ لیکن دریافت حال پر معلوم ہوا کہ اسکول نے اس دفعہ ایک نئی پالیسی اختیار کی ہے اور وہ یہ کہ ہر سال وہ دو ایسے غریب بچوں کو وظیفہ دے کر اسکول میں داخل کرے گا جو انتہائی ذہین اور محنتی ہوں۔ یہ ایک عمدہ پیش کش تھی۔ لہٰذا سینکڑوں بچے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے۔ جن میں سے پہلی اور دوسری پوزیشن لینے والے دو بچے منتخب کئے گئے انہی میں سے ایک زبیر تھا۔ شروع کے کئی ماہ تک تو ادریس نے اسے اپنا کلاس فیلو تسلیم ہی نہیں کیا۔ وہ ہر وقت زبیر کا مذاق اڑاتا رہتا۔ بات بات پر اسے غریبی کے طعنے دیتا اور اساتذہ سے اس کی جھوٹی سچی شکایتیں کرتا رہتا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس کے اس غلط رویے پر زبیر نے کبھی غصے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ادریس کی حرکتوں کو اہمیت ہی نہیں دیتا۔ پھر یکے بعد دیگرے اس نے ماہانہ ٹسٹ، سہ ماہی اور ششماہی امتحان میں اس قدر اعلیٰ کامیابیاں حاصل کیں کہ سب ہی استاد اسے بھی اہمیت دینے لگے۔ ان کامیابیوں اور حوصلہ افزائی کی بدولت زبیر میں اس قدر خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ اب وہ کھیلوں میں بھی حصہ لینے لگا اور جلد ہی اپنی محنت و لگن کی بدولت ان میدانوں میں بھی اپنا لوہا منوا لیا۔ جب کلاس کے زیادہ تر لڑکوں نے زبیر سے دوستی کر لی اور کئی طالب علم مشکل سوالات حل کرانے کے لئے اس کے ارد گرد رہنے لگے تو ادریس کو بھی اس کی حیثیت ماننی پڑی۔ کیونکہ اگر اب بھی وہ زبیر سے دشمنی رکھتا تو سبھی سے کٹ کر اکیلا رہ جاتا مجبوراً اس نے اپنا خراب برتاؤ ترک کر کے بظاہر زبیر سے دوستی کر لی لیکن اندر ہی اندر اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح زبیر سے اس کا مرتبہ چھین لے۔ اس نے قابل سے قابل ماسٹروں سے ٹیوشن پڑھنے شروع کر دیئے

ہر بار بڑی محنت کی۔ گھنٹوں پڑھتا رہا مگر جب بھی امتحان کا نتیجہ آیا تو زبیر نے پہلی پوزیشن لی اور ادریس نے کبھی دوسری کبھی تیسری، یونہی دونوں کو ساتھ پڑھتے پڑھتے کئی سال گذر گئے، اب وہ میٹرک کے طالب علم تھے اور زبیر یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ اسکول کا مرحلہ طے کر چکنے کے بعد اب وہ کس طرح اپنی تعلیم برقرار رکھ سکے گا اسے یوں فکر میں ڈوبا ہوا دیکھ کر ادریس کو بڑی خوشی ہوئی اسے زبیر کی پریشانی کی وجہ معلوم تھی وہ دل ہی دل میں سوچتا کہ اب اس کی جیت قریب ہے۔

زبیر اب مزید تعلیم حاصل نہیں کر سکے گا۔ اپنے اس زبردست حریف سے پیچھا چھوٹنے کے بعد ادریس کی کامیابی یقینی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرنے کے بعد ایک شاندار زندگی بسر کرے گا جب کہ زبیر کی قسمت میں زیادہ سے زیادہ کسی دفتر کی کلرکی لکھی ہے اپنی ان سوچوں کی وجہ سے ادریس بے حد مطمئن تھا۔

انہی دنوں اخبارات میں یہ خبر آئی کہ یہ سال عالمی سطح پر نوجوانوں کا سال قرار پایا ہے ہر حکومت اپنے اپنے دائرے میں وسائل کے مطابق نئی نسل کی فلاح و بہبود کے لئے اقدامات کر رہی ہے پاکستان میں بھی ایسے کئی پروگرام ترتیب دیئے گئے۔ اسی سلسلے میں وزارتِ تعلیمات نے ہر اسکول کو ایک مراسلہ جاری کیا کہ ہونہار طلباء کے لئے ایک مقابلے کا انتظام کیا گیا ہے جس میں کامیاب ہونے والے شخص کو سرٹیفکیٹ اور نقد انعام سے نوازا جائے گا۔ اسکولوں کے سربراہوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ سیکنڈری سطح کے دو بہترین طالب علموں کو اس مقابلے کے لئے منتخب کر کے مقررہ تاریخ کو مقررشدہ مقام پر بھیج دیں۔

ادریس اور زبیر کے اسکول میں بھی اساتذہ نے ایک میٹنگ کے بعد بغیر اختلاف کے انہی دونوں کو ان کے اچھے تعلیمی ریکارڈ کی بناء پر منتخب کر لیا۔ ادریس کو جب یہ خبر ملی تو پہلا خیال جو اس کے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ زبیر سے اپنے اگلے پچھلے سارے حساب برابر کرنے کا یہ سنہری موقع ہے اسے یہ آخری اور بھرپور مات اس طرح دینی چاہیئے کہ وہ اپنی ساری کامیابیاں بھول جائے۔ اس ارادے کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ جی جان سے مقابلے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

پہلا مرحلہ تھا فی البدیہہ تقریر کا۔ ادریس کو ہر حال میں مقابلہ جیتنے کا اس قدر جنون تھا کہ اس نے اپنے والد سے کہہ کر ایک خصوصی استاد کا انتظام کیا۔ جو ایسے مقابلوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

انہوں نے اپنے اندازے کی بناء پر کئی ایسے موضوعات پر چھوٹی چھوٹی تقریریں تیار کیں جو ان کے خیال میں مقابلے میں آنا یقینی تھے۔ وہ سارا دن ادریس کو مقابلے کا فن سکھاتے رہے، آواز کا کنٹرول ہاتھوں کی حرکات برمحل شعر پڑھنے کا انداز اور خود اعتمادی کا درس دیتے رہے۔ دُھن کا پکا شاگرد بھی سارے دن بغیر کھائے

پینٹے یا سستائے اپنے مورچے پر ڈٹا رہا۔ اس روز وہ اسکول بھی نہیں گیا۔ رات ہوئی تب بھی نیند اس کی آنکھوں سے غائب تھی۔ ٹہل ٹہل کر آئینے کے آگے مشق کرتے کرتے اس نے ساری رات گذار دی اور تمام کی تمام تقریریں رَٹ ڈالیں تاکہ ناکامی اور جھجک کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔

اس کے بَرخلاف زبیر کے تمام معمولات ہمیشہ کی طرح رہے۔ صبح سویرے اُٹھ کر اس نے پہلے اپنے گاہکوں کو اخبار پہنچائے پھر رُوکھی سُوکھی کھا کر اسکول چلا گیا۔ چھٹی کے بعد تین چار گھروں کے لان میں اپنے والد کا ہاتھ بٹایا اور شام کو جب اسکول کا کام مکمل کر چکا تو پھر تقریری مقابلے پر توجہ دی۔ وہ دِن بھر کا تھکا ہارا تھا۔ مختلف موضوعات پر سوچتے سوچتے نجانے کب سوگیا۔ محنت اور تھکن اپنے ساتھ ہمیشہ گہری پُرسکون نیند کا تحفہ لاتی ہے۔ وہ رات بھر کے آرام کے بعد صبح اٹھا تو بے حد تروتازہ تھا سب سے پہلے اس نے اخبار بانٹے، ناشتہ کیا اور پھر تیار ہو کر مقابلے میں شرکت کے لئے چل پڑا۔

پرنسپل صاحب اور کئی ساتھی وہاں پہلے ہی موجود تھے، ادریس بھی پہنچ چکا تھا۔ مگر سُست اور بے زار دکھائی دیتا تھا۔ زبیر نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی نشست پر بیٹھ کر غور سے مقرروں کے دلائل سننے لگا۔ کافی دیر کے بعد اس کی باری آئی۔ اتنی دیر میں اس نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ تقریر کرنے والوں کی کن حرکات پر ہوٹنگ ہوتی ہے اور کون سے انداز سراہے جاتے ہیں وہ بڑی خود اعتمادی سے اُٹھا اور اپنا موضوع ملنے کے بعد دل جمعی سے تقریر شروع کر دی وہ جس عنوان پر بول رہا تھا صرف اسی کے بارے میں سوچ جا رہا تھا اس کی مثال اس سوار کی سی تھی جسے اپنی منزل کا پتہ اچھی طرح معلوم ہو اور جو بغیر اِدھر اُدھر دیکھے، بغیر بھٹکے سیدھا اپنی راہ طے کرتا چلا جائے۔ چونکہ ذہن بھی حاضر تھا لہٰذا مناسب الفاظ یا جملوں کی ترتیب میں اسے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس کے پُراعتماد انداز نے سامعین کو بے حد متاثر کیا اور سننے والوں نے تقریر کے خاتمے پر بے تحاشا تالیاں بجا بجا کر اسے داد دی۔

وہ نپے تلے قدموں کے ساتھ اسٹیج سے نیچے اُتر آیا۔

اب ادریس کا نام پکارا گیا جسے دِن بھر کی دماغ پاشی اور رات بھر کی تھکن نے ادھ مُوا کر دیا تھا اسے جب اپنا موضوع ملا تو اپنی مہارت دکھانے کی کوشش میں اس نے تیز تیز بولنا شروع کر دیا تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دلائل دے سکے۔ سامعین کو سارے اچھے اشعار سنا کر مرعوب کر دے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ مختلف موضوعات پر بولے جانے والے جملے اور فقرے اس کے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے مختلف دلائل تھے جو بیک وقت اپنے اظہار کے لئے کوشاں تھے اس نے جب ان کی چھٹائی کرنا چاہی تو جملے بے ربط

ہو گئے۔ الفاظ کا قحط پڑ گیا اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ حاضرین نے اس کی کمزوری بھانپ کر شور مچا دیا اور آخر کار وہ بے پناہ ہوٹنگ کے درمیان تھکے تھکے پاؤں اُٹھاتا ڈائس سے نیچے اتر آیا۔ پرنسپل اور ساتھی لڑکوں نے اس کی ہمت بندھائی کہ کوئی بات نہیں۔ آج تم جم کر تقریر نہ کر سکے لیکن خیر یہ تو پہلا مقابلہ تھا۔ کوشش کرو کہ کل کھیلوں کے مقابلے میں کسر پوری کر لو۔

ادریس کو ان سب کی ہمدردی پر بھی شُبہ تھا اور پکا یقین تب ہو گیا جب وہ پلٹ کر زبیر کو گرمجوشی سے مبارکباد دینے لگے۔ اس کی پُرغرور طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ وہ ان کی خوشی میں شریک ہو۔ وہ زبیر کی مسکراہٹ اور چمکتے چہرے کا زخم اپنے سینے پر لئے وہاں سے چلا آیا دِل ہی دل میں یہ عہد کرتا ہوا کہ اسے ہر قیمت پر کل زبیر کو شکست دینی ہے۔ اُسے اِسی کے میدان میں مارنا ہے۔ کیونکہ زبیر دوڑ کا ماہر سمجھا جاتا تھا جب کہ ادریس کا انفرادی کھیل اونچی چھلانگ تھی۔ اس نے اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لئے اونچی چھلانگ کے ساتھ ساتھ دوڑ کی مشق بھی شروع کر دی اور بقیہ تمام دِن بلکہ رات کا خاصہ حصّہ بھی اسی چکر میں گذار دیا۔ بدلہ لینے کی دُھن میں اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے بے آرام اور اب یہ کڑی مشقت کہیں اسے بیمار نہ کر دے۔ چونکہ اس کی نیّت میں کھوٹ تھا۔ لہٰذا اسے پھل بھی ویسا ہی ملا۔ اگلی صبح جب وہ اکڑے ہوئے رگ پٹھوں اور چکرائے دماغ کے ساتھ مقابلے میں شامل ہوا تو نہ صرف دوڑ بلکہ خود اپنے کھیل میں بھی ہار گیا۔ اس دفعہ اس پر اتنی شرمندگی ہوئی کہ کسی سے ملے بغیر چپکے ہی سے گھر واپس آ گیا۔

اب اس کے شکست خوردہ ذہن نے اسے غلط مشورے دینے شروع کر دیئے۔ جیسے بھی ہو وہ یہ مقابلہ ہر قیمت پر جیتنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے والد کے تعلقات اور رسائی کا بھی بڑا مان تھا لہٰذا ان سے سامنا ہوتے ہی اس نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔

"ابو آپ تو وزیر تعلیم سے بھی واقفیت رکھتے ہوں گے نا پلیز ان سے میری سفارش کر دیں"

ابُو نے اسے سمجھانے کی کافی کوشش کی لیکن اس کی ضد نے انہیں مجبور کر دیا اور وہ وعدہ کر بیٹھے کہ اس سلسلے میں ان سے جو بھی ہوا وہ ضرور کریں گے۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ادریس نے دِل لگا کر اگلے روز کی تیاری شروع کر دی جس میں معلومات عامہ کا امتحان لیا جانا تھا۔ اس مقابلے میں اس کی کارکردگی خاصی بہتر رہی تو اس کا اعتماد بحال ہونے لگا اور اب آخری اور سب سے اہم مرحلہ تھا انٹرویو کا جسے وزیر تعلیم خود لینے والے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے تمام طلباء کو اپنے گھر مدعو کیا تھا جہاں ان کے لئے ایک چائے پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ابھی تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ انٹرویو کس طرح لیا جائے گا۔ کس قسم کے سوالات پُوچھے جائیں گے۔ اکثر و بیشتر لڑکے موٹی موٹی کتابیں اٹھا لائے تھے

وہ ہر مضمون پر اپنی تیاری مکمل رکھنا چاہتے تھے تاکہ تمام سوالات کے جواب دے سکیں۔ چائے سے فارغ ہو کر وزیر صاحب جن کا نام اقبال فاروقی تھا لڑکوں میں گھل مل گئے ان کے سوالات عام قسم کے اور سیدھے سادھے تھے۔ جن میں سے زیادہ تر کا تعلق طالب علم کی دلچسپیوں، معمولات، مشاغل اور مستقبل کے پروگرام سے تھا۔ اس طریقے سے وہ ان کی صلاحیتوں کو پرکھ رہے تھے، اعتماد کو جانچ رہے تھے اور ان کے عزائم کا اندازہ لگا رہے تھے۔ طلباء ان گہرے مقاصد کو نہ سمجھ سکے وہ تو اس بات پر پھولے نہ سما رہے تھے کہ وزیر صاحب رعب جمانے کی بجائے ان سے بالکل دوستانہ انداز میں گفتگو کر رہے ہیں۔ سوالات بھی ایسے پوچھ رہے ہیں جن کے جواب کے لئے نہ تو ذہن پر زور دینے کی ضرورت تھی نہ مشکل قسم کے الفاظ کی ادائیگی کی۔

اب فاروقی صاحب کا رُخ ادریس اور زبیر کی ٹیم کی طرف تھا۔ ان کے سیکرٹری نے انہیں وہ کاغذ تھما دیا جس پر اسکول کا نام اور دونوں طالب علموں کے اب تک کے مقابلے کے نتائج لکھے ہوئے تھے۔ فاروقی صاحب نے سرسری نظر ڈالی اور پوچھا آپ میں سے ادریس کون ہے؟

"جی سر! میں" ادریس تن کر کھڑا ہو گیا۔ "بہت خوب"۔ فاروقی صاحب نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا آج کے دن کے لئے ایک خاص ہدایت انہوں نے یہ دی تھی کہ طالب علم اپنی پسند کا لباس پہن کر آئیں یونیفارم پہننا لازمی نہیں ہے۔ سو ادریس اس وقت غیر ملکی انتہائی مہنگے تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے جوتے شیشے کی مانند چمک رہے تھے۔ کلائی پر بیش قیمت گھڑی تھی اور اس نے بے حد تیز خوشبو لگائی ہوئی تھی۔

فاروقی صاحب نے اس سے سوال کیا۔ "اپنے بارے میں ایسی چار چیزوں کے نام بتائیے جن پر آپ کو فخر ہو" ادریس کی آنکھیں چمکنے لگیں، چار تو کیا وہ ایسی چار سو چیزوں کے نام گنوا سکتا تھا پھر اس نے نہایت شان سے جواب دیا۔ "سر صرف چار چیزوں کا انتخاب کرنا مشکل ہے پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تو مجھے اپنے ڈیڈی پر فخر ہے" "اس کی وجہ؟" فاروقی صاحب نے پوچھا۔

"وہ بہت بڑے آدمی ہیں، بے شمار دولت کے مالک، بڑے بڑے آدمیوں سے جان پہچان رکھتے ہیں اور کہ آج تک انہوں نے میری کوئی بات نہیں ٹالی"

"ان کا نام اظہر بیگ تو نہیں" فاروقی صاحب نے سوال کیا۔

"جی ہاں..... تو آپ بھی ان سے واقف ہیں" ادریس کی باچھیں کھل گئیں۔

"کل تک تو نہیں تھا" فاروقی صاحب کے چہرے پر ناگواری چھا گئی۔ ادریس کی سمجھ میں ان کے جواب کا مطلب نہ آیا تو وہ خاموش کھڑا رہا

"ہاں تو بیٹے تین اور چیزیں نہیں بتائیں آپ نے"

"اوہ۔ ان میں سے ایک تو ہماری مرسیڈیز کار ہے، اتنی لمبی جیسے بحری جہاز، دوسرے نمبر پر میرا کتا جس کی قیمت نو ہزار روپے ہے اور تیسرے بے شمار وڈیو گیمز جنہیں ڈیڈی میرے لئے ہر غیر ملکی دورے کے بعد لاتے ہیں۔ پاکستان میں تو اتنے سارے اور قیمتی وڈیوز کسی کے پاس نہ ہوں گے۔"

ادریس کا سر بالشت بھر اونچا ہو گیا۔

"بہت خوب" فاروقی صاحب نے آخری سوال پوچھا۔ "بڑے ہو کر آپ کیا بننا چاہتے ہیں"

"نوکری تو مجھے کرنے کی ضرورت نہیں ہے سر، میرے ڈیڈی کا کاروں کا شوروم ہے بس اسی کو سنبھالوں گا"

"خوب خوب"۔ کہتے ہوئے وزیر تعلیم نے زبیر پر نظر ڈالی جو اسکول یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ "ارے بھئی کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ آج کے دن کے لئے یونیفارم کی قید نہیں ہے"؟ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ زبیر کے جواب دینے سے پہلے ہی ادریس بول پڑا۔

"سر! اس بچارے کے پاس ایسے کپڑے ہی نہیں ہیں جو یہاں پہن کر آتا۔ یونیفارم تو اس نے مجبوراً پہنی ہے" یہ کہکر وہ ہنس پڑا۔

فاروقی صاحب نے تیز نظر اُس پر ڈالی کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اس دن کے لئے انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کسی کو نہیں ڈانٹیں گے وہ انہیں ان کے اصلی روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جواب طلب انداز میں زبیر کو دیکھا۔ وہ آہستہ سے بولا "سر! انہوں نے پہلی جو بات کہی ہے وہ درست ہے لیکن یونیفارم میں نے مجبوراً نہیں پہنی چاہتا تو روزمرہ پہننے والے شلوار قمیض بھی پہن کر آسکتا تھا"

"وجہ بتاؤ گے اس کی"؟ وزیر صاحب نے دریافت کیا۔

"میں نے سوچا سر! کہ آپ نے ہمیں طالب علموں کی حیثیت سے بلایا ہے لہٰذا اس موقع کے لئے یونیفارم ہی موزوں رہے گی"

"واہ۔" انہوں نے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر بولے۔ "والد صاحب کیا کرتے ہیں آپ کے"؟

ادریس سے پھر نہ رہا گیا: "سر! وہ مالی ہے، کئی گھروں میں کام کرتا ہے، یہ بھی اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔" فاروقی صاحب کا چہرہ ایک لمحے کے لئے سُرخ ہو گیا لیکن وہ زبیر ہی سے مخاطب رہے۔ "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا بیٹے۔"

"یہ صحیح ہے جناب کہ میرے والد مالی ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ کام کرتا ہوں" وہ بے جھجک بولا۔

"آپ کو تو وہ زبردستی لے جاتے ہوں گے اپنے ساتھ"

جی نہیں۔۔ مجھے تو یہ کام کرتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے "

"وہ کیسے ؟" فاروقی صاحب نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اس طرح ایک تو مجھے یہ سوچ کر خوشی ملتی ہے کہ میں اپنے والد کا بوجھ کم کر رہا ہوں۔ دوسرے اس خیال سے بھی فخر کرتا ہوں کہ میرے ہاتھ اپنے وطن کو سجا رہے ہیں "

"تب تو پھر مبارک ہو کہ تم ساری عمر اسی حیثیت سے وطن کی خدمت کرتے رہو گے کالج جانے کی اوقات تو ہے نہیں تمہاری" ادریس نے جل کر کہا۔ زبیر کو ذلیل کرنے کی دُھن میں وہ اخلاق کی حدوں سے گزر چکا تھا۔

فاروقی صاحب نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک انٹرویو مکمل ہوا۔ اور اتنا ہی وقت نتائج کی ترتیب میں لگا۔ فاروقی صاحب لگے بندھے اُصولوں اور طریقوں پر سختی سے عمل کرنے کے قائل نہ تھے اس لئے وقت کی بچت کی خاطر صدارتی تقریر اور نتائج کا اعلان بیک وقت کرنے کی خاطر انہوں نے مائک سنبھالا۔ طلباء اپنے تیزی سے دھڑکتے دلوں کے ساتھ خاموشی سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ فاروقی صاحب نے کہنا شروع کیا۔

"عزیز بچو، آج کی اس ملاقات کے دوران مجھ پر آپ لوگوں کی خوبیاں اور خامیاں دونوں ظاہر ہوئی ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ تاکہ ان کی روشنی میں آپ اپنی خامیوں کو دُور کرنے اور خوبیوں کو مزید جلا بخشنے کی کوشش کریں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آج طلبا کی اکثریت علم کو حصولِ دولت کا ذریعہ سمجھتی ہے، علم کی بذاتِ خود ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مستقبل کے نام پر جو سوالات پُوچھے گئے ان میں سے زیادہ تر کا ووٹ ایسے پیشوں کے لئے تھا جنہیں اختیار کر کے وہ جلد از جلد امیر کبیر بن جائیں حالانکہ اپنی پسند کو معتبر بنانے کے لئے خدمتِ خلق یا پاکستان کو ترقی دینے کا ٹانکا بھی لگایا گیا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا خدمتِ خلق صرف ڈاکٹر، انجینئر یا بیرسٹر ہی کر سکتے ہیں، کسان، مزدور یا استاد اس کے اہل نہیں ؟ مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ سب لوگ ماشاءاللہ اپنے اسکولوں کے بہترین طالب علم ہیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں جو ہمیشہ فرسٹ یا سکینڈ پوزیشن نہ لیتا رہا ہو لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ زیادہ تر کا یہ علم کتابوں کو رٹنے کا محتاج ہے وہ اپنے ذہن سے سوچ کر زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوئی بہتر تجویز نہیں دے سکتے انہیں فخر ہے تو اپنے امیر والدین پر، آرام آسائش کی چیزوں پر حالانکہ انسان کے لئے سب سے فخر کی چیز اس کی محنت، بائتسہ زندگی اور وطن کی محبت ہوتے ہیں۔"

"آخری اور سب سے تکلیف دہ چیز جو مجھے نظر آئی وہ غرور اور حسد کا جذبہ ہے۔ آپ میں سے کچھ بچے خدا

کی عطا کی ہوئی نعمتوں پر اس قدر نازاں ہیں کہ اپنے ہی ساتھیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر کسی کو صلاحیتوں کے اعتبار سے خود سے بڑھ کر پاتے ہیں تو حسد میں مبتلا ہو کر اوچھی حرکتوں پر اتر آتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تعلیم ہمیں انسانوں کا احترام اور دوسری مخلوقات سے ہمدردی کرنا سکھاتی ہے۔ یاد رکھو میرے عزیزو کہ عزور ایسی بیماری ہے جس کا مریض ساری دنیا سے الگ ہو کر رہ جاتا ہے اور حسد ایسی آگ ہے جو خود حاسد ہی کا تن من جلاتی رہتی ہے۔ جہاں تک بن پڑے خود کو ان سے محفوظ رکھو۔"

" اب رہا معاملہ بہترین طالب علم کا تو میری نصیحتوں کی روشنی میں آپ خود اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ ایسا نوجوان ہے جو صرف کتابوں کا قیدی نہیں خود اپنے دماغ سے کام لیتا ہے۔ دولت اور مرتبے کی بجائے محنت کو وقعت دیتا ہے۔ اس کی عزت اس کا اعتماد نہیں چھین سکتی۔ وہ جہاں اور جس حال میں ہے بزرگوں کی خدمت اور وطن کی عظمت کے لئے کام کرنا پسند کرتا ہے۔ لہٰذا پچھلے مقابلوں کے نتائج اور آج کے انٹرویو کے بعد میں زبیر اسلم کو سال کا بہترین طالب علم قرار دیتا ہوں

یہ کہتے ہوئے فاروقی صاحب نے زبیر کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا جو حیران پریشان سا آگے بڑھا، کیمرے پلکیں جھپکنے لگے۔ تالیوں کی گونج، مبارک باد کا شور اور اخبار نویسوں کے گروہ نے زبیر کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

فاروقی صاحب نے زبیر کو اپنے قریب کرتے ہوئے ایک اور اعلان کیا۔

زبیر آج اسکول کا ایک مثالی طالب علم ہے۔ پاکستان کو ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے ایسے لڑکے کو ترقی کی راہ پر ڈالنا دراصل پاکستان کو ترقی دینے کی کوشش ہے۔"

لہٰذا دس ہزار روپے نقد انعام اور سرٹیفکیٹ کے ساتھ ساتھ حکومت زبیر کی اعلیٰ تعلیم کا ذمہ بھی اپنے سر لیتی ہے"

ان کے اس اعلان کے ساتھ ہی شور میں بے پناہ اضافہ ہو گیا، لڑکے زبیر کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اس سے اپنی دوستی کا ثبوت پیش کر سکیں بے شمار ہاتھ اس سے مصافحے کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ اخبار نویسوں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر رکھی تھی۔ ٹی وی کی خبروں کے لئے اس اہم موقع کی فلم بنائی جا رہی تھی۔

اس ہنگامے، شور اور روشنیوں سے دور ادرس ایک طرف اکیلا کھڑا تھا۔ اس کی دولت، بہترین لباس اور اعلیٰ نسبی کے باوجود ایک فرد بھی ایسا نہ تھا۔ جو شکست و شرمندگی کے اس کٹھن لمحے میں اسے تسلی دیتا۔

بار بار جو رنگ بدلتے، وہ گرگٹ کہلاتے ہیں

خوفناک
شکل و صورت اور
بڑے ڈیل ڈول
کے باعث "ننھا شیر"
کہلانے والا
گرگٹ

ایک ہی نسل
کی دو مکڑیاں
مگر رنگ
جُدا جُدا

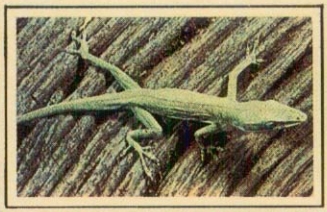

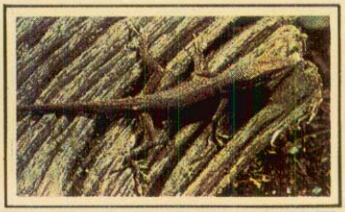

ایک منٹ کے اندر اندر کیا سے کیا ہو جاتا ہوں!

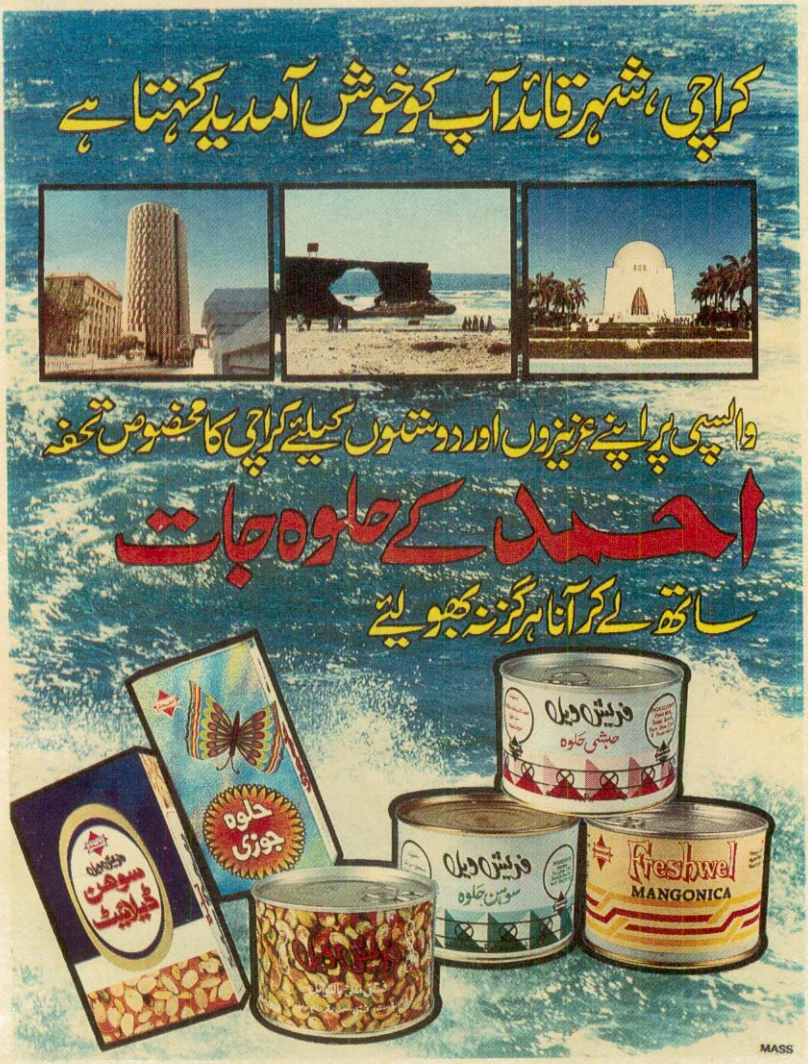

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
فریش ویل
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
سوہن ڈیلائیٹ
فریش ویل
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA
MASS

بدلتے ہیں رنگ، بے زباں کیسے کیسے؟

سلمیٰ سلیم

"دیکھو! دیکھو! وہ شرم کے مارے سُرخ ہو رہا ہے!"
"ابو کی ڈانٹ سُن کر ننھا خوف کے مارے کاغذ کی طرح سفید ہو گیا۔"
"اس کا چہرہ غصّے سے لال ہو رہا تھا۔"

آپ نے یقیناً ایسے جملے بار ہا سنے یا کہے ہوں گے ۔ انسان کے چہرے کے رنگ میں آنے والی ان تبدیلیوں کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً سخت سردی، خوف، غصّہ، شرم وحیا، شرمندگی، وغیرہ ماہرین کے مطابق یہ تبدیلیاں انسانی جسم میں گردش کرنے والے خون کی کمی بیشی کے باعث آتی ہیں۔ خون کی زیادتی چہرے کو لال اور کمی سفید بنا دیتی ہے۔

انسانوں کی طرح بعض جانوروں میں بھی رنگ تبدیل کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں میاں گرگٹ تو دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ خیال ہے کہ جانوروں کی جلد میں رنگ کی تبدیلی جوش، نیند کی کیفیت یا سردی کے باعث ہوتی ہے، تاہم اس کے کچھ اور اسباب بھی ہیں۔ مثلاً جب کوئی جانور کسی دوسرے جانور کو اپنی سلطنت کی حدود سے دور رکھنا چاہتا ہے تو وہ اُسے رنگ کی تبدیلی کے ذریعے اپنے جذبہ سے مطلع کرتا ہے۔ کچھ جانور اپنے دشمنوں سے خود کو چھپانے اور انہیں فریب دینے کے لیے بھی رنگ بدل لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر گرگٹ صاحب تو اپنے دشمن کو دیکھتے ہی اپنے اطراف میں موجود پیڑ پودوں کی طرح کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ بہت سے جانور اپنے شکار کو پھلسنے کے لئے بھی رنگ بدلتے ہیں۔ ان کا شکار اُن کی موجودگی سے بے خبر جوں ہی اُن کے پاس آتا ہے وہ اُسے اُچک لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جانوروں کی رنگت میں یہ تبدیلی آتی کس طرح ہے؟ ماہرین کے بقول اس کے یوں تو کئی اسباب ہیں مگر اہم ترین سبب یہ ہے کہ ان جانوروں کی جلد میں خاص قسم کے خلیے پائے جاتے ہیں ان خلیوں کو CHROMATOPHOSES کہتے ہیں۔ یہ خلیے کبھی شکلاً اور کبھی تعداد میں تبدیل ہوتے ہیں۔ ان خلیوں میں تبدیلی آتے ہی جانوروں کی رنگت بدل جاتی ہے۔ یہ خلیے اس لیے بدلتے ہیں کہ انہیں جانور کے جسم کے مختلف حصّوں خاص طور پر اعصابی نظام سے تبدیلی کا حکم ملتا ہے۔

کچھ جانور صرف ایک رنگ بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جبکہ کچھ جانور ایک سے زیادہ رنگ بدل سکتے ہیں۔ مثلاً گرگٹ اور خاص مکڑیاں جو پیلا، ہرا لال اور بھورا رنگ بدل سکتی ہیں۔ عام طور پر رنگ کی تبدیلی کا عمل چند منٹوں اور کبھی کبھی چند سیکنڈوں میں پورا ہو جاتا ہے۔ خیال ہے کہ کچھ جانور اپنی رنگت کی تبدیلی کو دوسرے جانوروں تک مخصوص پیغام پہنچانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

انسانوں اور جانوروں میں رنگ بدلنے کی خاصیت میں بس ایک فرق ہے۔ جانور اپنا رنگ بدلنے پر قادر ہوتے ہیں جبکہ انسان اپنے رنگ کی تبدیلی پر قادر نہیں ہوتے۔ ارے ہم نے غلط کہا کچھ انسان ہوتے ہیں۔ مثلاً ہمارے سیاست داں۔ یہ ادرہات کہ یہ حضرات چہرے کے رنگ کی بجائے اپنے کردار کا رنگ بدلتے ہیں۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے۔

بار بار جو رنگ بدلتے   وہ گرگٹ کہلاتے ہیں
ان کے پیچھے چلنے والے   سدا ہی دھوکہ کھاتے ہیں

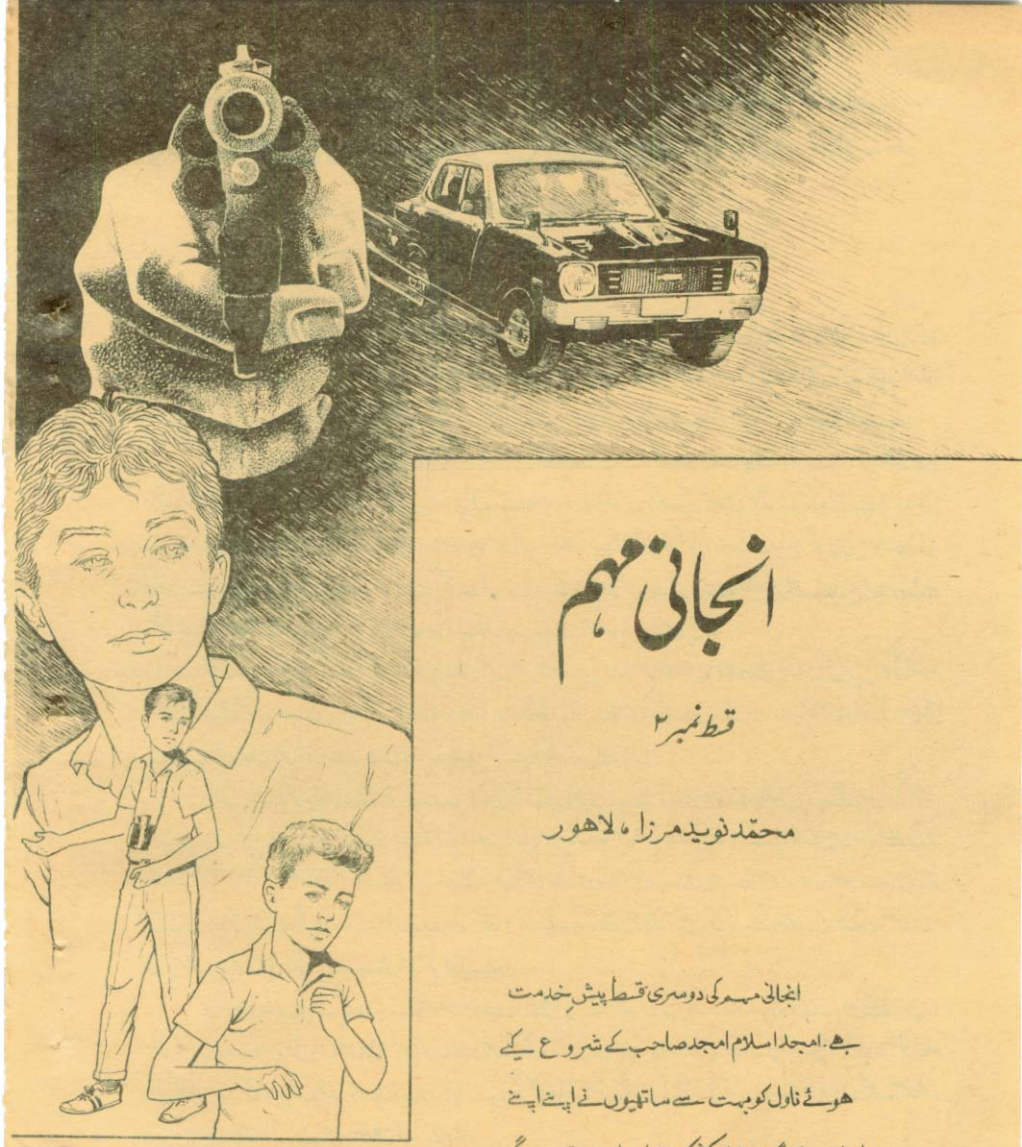

انجانی مہم

قسط نمبر ۲

محمد نوید مرزا، لاہور

انجانی مہم کی دوسری قسط پیشِ خدمت ہے۔ امجد اسلام امجد صاحب کے شروع کیے ہوئے ناول کو بہت سے ساتھیوں نے اپنے اپنے انداز سے آگے بڑھایا۔ اکثر کہانیاں دلچسپ تھیں مگر ادارے کے سبھی افراد کی رائے میں لاہور کے محمد نوید مرزا کی قسط زیادہ دلچسپ تھی۔ آپ بھی پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے ... یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا... اس کی اگلی قسط ابھی لکھی جانی ہے۔ اس لیے پہلی فرصت میں "انجانی مہم" کی تیسری قسط لکھ کر ارسال کر دیجیے۔ ہم منتظر ہیں۔ ایک گزارش

یہ بھی کرنی ہے کہ چونکہ اکتوبر کے شمارے کی طباعت کے بعد نومبر کے شمارے کی تیاری میں زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اس لیے آپ کو بھی لکھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دیا جاسکتا۔ اس دلچسپ مقابلے میں شرکت کے ضروری ہے کہ آپ کی لکھی ہوئی تیسری قسط ہمیں لازماً ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۹ سے قبل مل جائے۔ وقت کی کمی سے مقابلہ کرنے کے لئے احتیاطاً اگر آپ اپنی کہانی محکمۂ ڈاک کے یو ایم ایس سروس یا کسی اور تیز رفتار ذریعے سے ہمیں بھجوائیں۔ واضح رہے کہ سب سے بہتر کہانی کو بطور انعام خوبصورت تحفہ بھجوایا جائے گا اور دیگر اچھی کہانیوں کے مصنفین کا نام بھی شامل اشاعت کیا جائے گا۔ ابتدائی مہم کی موصول ہونے والی بہت سی دوسری اقساط کے مصنفین کا نام کہانی کے آخر میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

صفدر منصور اور ذیشان آپس میں گہرے دوست ہیں۔ لاہور جانے کے لئے وہ کراچی اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے دورانِ سفر ایک پُراسرار شخص جس نے نیلا کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ اُن سے باتیں کرنے لگا۔ دورانِ گفتگو منصور کے ہاتھ میں ذیشان نے ایک پرچی تھمائی جس پر کوڈ ورڈ کا ایک جملہ تحریر تھا۔ باتھ روم میں جاکر منصور نے پرچی دیکھی تو اس پر درج تھا کہ "ھو بڑ ناٹواگ ہوام یا" یعنی "یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے" منصور ہاتھ دھوکر باتھ روم سے نکلا تو اُسے شدید حیرت ہوئی کیونکہ نیلے کوٹ والا غائب تھا لیکن اس کا کوٹ نشست پر موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنا کوٹ چھوڑ کر سوٹ کیس لے کر روانہ ہو گیا۔ اچانک منصور نے اپنے سامان کو دیکھا تو پتا چلا کہ نیلے کوٹ والا اپنا سوٹ کیس چھوڑ کر ان کا سوٹ کیس لے گیا ہے۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار بھی کم ہونے لگی۔ اب آپ آگے پڑھئے

اور پھر گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی سے اُتر کر نیلے کوٹ والے کی تلاش کرتے گاڑی نے وسل دی اور پلیٹ فارم سے آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسٹیشن سے دُور ہوتے چلے گئے۔

"اب کیا کریں! وہ حضرت تو ہمارے سوٹ کیس پر ہاتھ صاف کر گئے" ذیشان نے دونوں دوستوں کی طرف دیکھ کر قدرے پریشان ہو کر کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں خدا بہتر کرے گا" صفدر نے کہا۔

"ہاں بھئی آخر وہ بھی تو اپنا سوٹ کیس یہیں چھوڑ گیا ہے لہٰذا حساب برابر۔۔۔" منصور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہمارے سوٹ کیس میں کپڑوں کے علاوہ کوئی قیمتی چیز نہ تھی کپڑے ہم لاہور جاکر ریڈی میڈ خرید لیں گے" صفدر بولا۔

"یہ بھی اچھا ہوا کہ ہماری نقدی ہماری جیبوں میں ہے اور کیمرے و دیگر قیمتی سامان دوسرے بیگوں میں

تھے۔" ذیشان نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ نیلے کوٹ والا سوٹ کیس میں کچھ غیر قانونی چیزیں چھوڑ گیا ہے اور پچھلا اسٹیشن چونکہ ملٹری کا علاقہ ہے اور عام پولیس بھی آتی جاتی رہتی ہے۔ لہٰذا وہ اس ڈر سے اپنا سوٹ کیس نہیں لے گیا۔" صفدر مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اُسے سامنے سے وردی میں ملبوس ایک انسپکٹر اپنے کانسٹیبلوں کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ وہ چُپ ہو گیا۔ ٹرین کے مسافر اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے پولیس انسپکٹر کو اپنے قریب آتا دیکھ کر سہم سے گئے اور خاموش ہو گئے۔ انسپکٹر نے نظر بھر کر سوٹ کیس کی طرف دیکھا پھر اُس کی نظر نیلے کوٹ پر پڑ گئی اور وہ بول اُٹھا: "ہمیں ایک ایسے ہی سوٹ کیس اور نیلے کوٹ والے شخص کی تلاش ہے۔" اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اصل میں وہ غیر قانونی طور پر ہمارے مُلک کی سرحد میں داخل ہوا تھا۔ پولیس اُس کے تعاقب میں ہے۔ بارڈر پولیس نے جو اُس کی جسامت اور قدوقامت بتائی تھی وہ آپ میں کسی کی نہیں لیکن اُن کے بتائے ہوئے سوٹ کیس اور نیلے کوٹ کو دیکھ کر دل یہ کہہ رہا ہے کہ وہ دونوں چیزیں یہیں میرے سامنے پڑی ہیں۔" انسپکٹر بڑا باتونی لگ رہا تھا۔ اس لئے باتیں کرتا چلا گیا۔

"لگتا ہے آپ مقرر بھی رہے ہیں تبھی بہت اچھا بول رہے ہیں لیکن اطلاعاً عرض ہے کہ یہ سوٹ کیس اور نیلا کوٹ ہمارا ہے اگر آپ چاہیں تو ہماری اور سوٹ کیس کی تلاشی لے سکتے ہیں لیکن اس سے پہلے یہ کارڈ ملاحظہ کریں۔" ذیشان نے کہا اور جیب سے ایک کارڈ نکال کر انسپکٹر کے آگے کر دیا۔ انسپکٹر نے کارڈ پڑھا اور بولا: "پرائیویٹ سیکریٹ سروس... کیا آپ پرائیویٹ سیکرٹ سروس کے رُکن ذیشان ہیں اور یہ دونوں آپ کے ساتھی منصور اور صفدر ہیں؟"

"جی ہاں ہمارے انکل کرنل رحمان سے بھی آپ واقف ہوں گے جنہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت کی اجازت سے وطن کی محبت سے سرشار ہو کر اپنا ایک جاسوسی ادارہ کھول رکھا ہے جو مُلک دشمن عناصر کا محاسبہ کرتا ہے اور ہم تینوں بھی اپنے انکل کی مہموں میں اُن کے ساتھ ہوتے ہیں۔" صفدر نے تفصیل بتائی۔

"اچھا... آپ تو بڑے مشہور و معروف لوگ ہیں بھلا آپ کیسے قانون توڑ سکتے ہیں، میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ پر شک کیا دراصل مختلف ڈبّوں میں کئی لوگوں کی تلاشی لی لیکن کوئی سُراغ نہیں ملا۔ اب ذرا ایک سرا ہاتھ آیا تھا تو آپ پر شک کرنا لازمی تھا۔" انسپکٹر نے کہا اور اُن سے ہاتھ ملا کر چلنے لگا پھر وہ بولا... "میرا نام انسپکٹر اصغر ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

"یار آج تو انکل رحمان کے کارڈ نے جان بچائی جو ہر وقت ہم تینوں کی جیبوں میں موجود رہتے ہیں۔" منصور نے آہستہ سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں رات کے وقت سوٹ کیس کو کھول کر دیکھنا چاہیے، جب سب لوگ سو جائیں۔"

تینوں نے متفقہ فیصلہ کیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے شام کے چھ بج رہے تھے۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے انہیں وقت کا احساس نہ ہُوا۔ رات کی سیاہی پھیلنے لگی تھی۔ پھر رات ساڑھے آٹھ بجے اُنھوں نے ڈائننگ کار سے کھانا منگوا کر کھایا اور بعد میں اپنے تھرماس سے چائے نکال کر پی۔ رات کے تقریباً دس بجے تینوں دوستوں نے مسافروں کو بے خبر سوتے دیکھ کر سوٹ کیس اُٹھایا اور باتھ رُوم کا رُخ کیا۔ ذیشان نے اپنی جیب سے ماسٹر چابی نکالی جو وہ ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ پھر وہ سوٹ کیس کھولنے میں جُت گیا۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد وہ سوٹ کیس کا تالا کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ذیشان نے آہستہ سے سوٹ کیس کو کھولا۔ سوٹ کیس کے کھُلتے ہی اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ سونے کی اینٹیں اور ننھے منّے ہیرے اُن کی آنکھیں چُندھیا رہے تھے۔

"یہ... کک... کیا ہے؟" منصور اُچھل پڑا۔

"ارے یار چُپ رہو۔ دیکھ نہیں رہے؟" منصور بولا۔

"میرا خیال ہے اسے فی الحال بند کر کے اپنی سیٹ کے نیچے رکھ دیں اور کسی کو نہ بتائیں۔ لاہور پہنچ کر خالو کی مدد سے کسی تھانے میں قابلِ اعتماد پولیس آفیسر کے حوالے کر دیں گے۔" ذیشان نے خیال ظاہر کیا اور منصور اور صفدر بھی اُس سے متفق ہو گئے۔ تینوں سوٹ کیس لے کر اپنی جگہ آ گئے اور اپنی اپنی برتھوں پر جا کر لیٹ گئے۔ سوٹ کیس ذیشان کے سر کے نیچے تھا کچھ دیر بعد تینوں نیند کی وادیوں میں کھو گئے صبح سب سے پہلے منصور کی آنکھ کھُلی اُس نے ذیشان کی طرف دیکھا... سوٹ کیس اُس کے سر کے نیچے موجود تھا کچھ دیر بعد ذیشان اور صفدر بھی آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اُنھوں نے صبح کا ناشتہ کیا اور گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ ٹرین اُس وقت اوکاڑہ اسٹیشن پار کر چکی تھی پھر وقت گزرتا گیا اور ٹرین لاہور ریلوے اسٹیشن پر جا کر رُک گئی۔ تینوں نے نیلے کوٹ اور سوٹ کیس کے علاوہ اپنا سامان بھی اُٹھایا اور اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ اس وقت وہ کسی رکشہ یا ٹیکسی کی تلاش میں تھے کہ منصور کے خالو کے ہاں پہنچیں۔ لاہور میں منصور کے خالو کا گھر تھا۔ اُن کی شخصیت بڑی دلچسپ تھی۔ اُن کی مزاحیہ طبیعت کے باعث جب بھی وہ کراچی اپنے دفتری کام کے

سلسلے میں آتے، صفدر اور ذیشان بھی اُن سے ضرور ملتے۔ دونوں خود بھی اُنہیں خالو کہہ کر پکارتے تھے۔ ابھی وہ کوئی سواری ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ ایک ٹیکسی اُن کے قریب آکر رُکی۔ ڈرائیور نے اپنا ہیٹ آنکھوں تک سرکایا ہُوا تھا۔

"بیٹھئے کہاں جانا ہے میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں" ڈرائیور نے کہا۔

تینوں پہلی دفعہ لاہور آئے تھے۔ منصور نے اپنی جیب سے خالو کا پتہ نکالا اور ڈرائیور کو بتا دیا پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ٹیکسی چل پڑی تقریباً آدھ گھنٹہ کے سفر کے بعد اُنہیں محسوس ہُوا کہ شہر سے باہر جا رہے ہیں۔

"ڈرائیور! یہ کیا حرکت ہے۔ تم ہمیں کہاں لئے جا رہے ہو؟" صفدر نے سخت لہجے میں کہا۔

"منہ سے ایک لفظ بھی نکالنے کی ضرورت نہیں" ڈرائیور کرخت لہجے میں بولا اور اپنا ہیٹ سر سے اُتار دیا۔ تینوں کو ایک جھٹکا لگا۔ ڈرائیور وہی نیلے کوٹ والا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پستول چمک رہا تھا۔ پستول کی نال کا رُخ منصور، ذیشان اور صفدر کی جانب تھا۔

اس سنسنی خیز کہانی کی تیسری قسط لکھنے کے لیے قارئین کو دعوت دی جا رہی ہے

"انجانی مُہم" کے لکھنے والے

ہماری نئی سلسلہ وار کہانی "انجانی مہم" جس کی پہلی قسط مشہور ڈرامہ نگار اور شاعر امجد اسلام امجد نے تحریر کی تھی، پڑھنے والوں میں بہت مقبول ہوئی۔ ہمیں بہت سے ساتھیوں کی لکھی ہوئی دوسری قسط بھی موصول ہوئی۔ ان میں بعض قسطیں تو واقعی بے حد دلچسپ تھیں۔ جن دوستوں کی کہانیاں شائع نہیں ہو سکیں وہ ہرگز مایوس نہ ہوں اور آئندہ بھی لکھتے رہیں کیا خبر کہ آئندہ قسط ان ہی کی شائع ہو۔ موصول ہونے والی قسطوں میں جن تحریروں کو بہتر خیال کیا گیا اُن کے مصنّفین کا نام درج ذیل ہے۔ (۱) محمد عادل منہاج (نیو کراچی) (۲) عمر خطاب خان صمم (اورنگی ٹاؤن کراچی) (۳) ارسلان ظہیر (گجرات) (۴) محمد عارف انیس (؟) (۵) عابد علی انجم (لطیف آباد) (۶) ساجد حسین جعفری (لطیف آباد) (۷) صابر علی آفاق (لطیف آباد) (۸) کاشف شہزاد (فیڈرل بی ایریا کراچی) (۹) سیّد عبدالرافع (حیدر آباد) (۱۰) محمد طاہر (لاہور) (۱۱) شازیہ فرحین (کراچی) (۱۲) خورشید احمد کمال (کھلابٹ ٹاؤن) (۱۳) نعیم احمد ادیب (کراچی) (۱۴) ارم فلمہ (۱۵) عدیل سلیم

نیوٹن

ایک پھسڈّی بچّہ

طاہر مسعود

۱۲ برس کی عمر میں گرینتھم کے گرامر اسکول میں میری تعلیم شروع ہوئی۔ میں اپنی تعلیم کی طرف سے بڑا غافل تھا۔ اور اسکول بھر میں پھسڈّی رہتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک کے سوا سب لڑکے مجھ سے آگے تھے۔ اور میں اُن سب سے پیچھے تھا۔" کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ الفاظ دنیا کے مشہور سائنس دان نیوٹن کے ہیں۔ نیوٹن جس نے کششِ ثقل کا قانون دریافت کیا۔

وہ بچپن میں لکھنے پڑھنے سے جی چُرانے والا لڑکا تھا۔ اور ۱۶۴۲ء میں انگلستان کے ضلع لنکا شائر کے ایک گاؤں کالسٹر ورتھ کے قریب پیدا ہوا تھا۔ باپ کا انتقال نیوٹن کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لیے دُنیا میں اس کے لیے مسرّت کا سامان بہت زیادہ نہ تھا۔ وہ ایک چھوٹے قدوقامت کا بچّہ تھا۔ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو اُس کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ اُسے باری باری دو اسکولوں میں داخل کیا گیا۔ لکھنے پڑھنے سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اساتذہ اس سے مایوس تھے۔ لیکن ایک واقعے نے اُس کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔

ایک دن نیوٹن دوسرے بہت سے لڑکوں کے ساتھ اسکول جا رہا تھا۔ اچانک کسی بات پر ایک لڑکے نے بڑھ کر نیوٹن کے پیٹ پر لات ماردی۔ نیوٹن درد سے بلبلا اُٹھا۔ اور پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ نیوٹن نے مار مار کر اس لڑکے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ وہ لڑکا پڑھائی کے میدان میں نیوٹن سے آگے تھا۔ یہ بات نیوٹن کو گوارہ نہ

تھی۔ اُس نے اپنے دشمن لڑکے کو نیچا دکھانے کے لیے محنت کرنی شروع کر دی۔ چونکہ وہ غیر معمولی ذہین تھا اس لیے بہت جلد اُس نے نہ صرف اس لڑکے کو بلکہ سارے اسکول کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اسکول ہی کے زمانے میں نیوٹن کو کلوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے اوزاروں سے مشہور کلوں کی نقلیں کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ پن چکّی بناتا۔ کبھی ایسی گاڑی بناتا جس کو بیٹھنے والا جہاں چاہے اپنے ہاتھ سے چلا کر لے جائے۔ اسکول کے پاس ایک پن چکّی تھی۔ نیوٹن نے اُس کو دیکھا تو اُس کے دل میں بھی ایسی ہی پن چکّی بنانے کی خواہش نے جنم لیا۔ پھر اُس نے اس نمونے پر ایک بڑی پن چکّی بنائی اور اُسے اپنی چھت پر نصب کر دیا۔ اب دُور سے دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ نیوٹن کے گھر کی چھت پر ایک پن چکّی ہوا سے ہلتی نظر آتی ہے۔

نیوٹن خاموش طبیعت کا لڑکا تھا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ جب دوسرے بچے کھیل کُود میں مصروف رہتے تھے، نیوٹن اپنے گھر میں بیٹھا اپنے اوزاروں سے کوئی نہ کوئی چیز بنانے میں مگن رہتا تھا۔ اپنی عمر کے لڑکوں سے اس کی دوستی بھی تھی اور وہ بڑے شوق سے نئے نئے کھیل ایجاد کر کے انھیں سکھاتا رہتا تھا۔ اُس نے بچوں کو پتنگ اُڑانا سکھایا اور ایسے طریقے بتائے جس سے پتنگ کو خوب اچھی طرح سے اُڑایا جا سکے۔ اُسی نے قندیلیں بنائیں۔ جاڑوں کی اندھیری صبح میں وہ ایک لالٹین لے کر اسکول جایا کرتا تھا اور رات کے وقت وہ اسی لالٹین کو اپنی پتنگ کی دُم کے ساتھ باندھ کر اُڑاتا تھا۔ جس کو دیکھ کر علاقے کے لوگ سمجھتے تھے کہ آسمان پر دُمدار ستارا نکلا ہے اور وہ سہم جاتے تھے۔ کیونکہ دُمدار ستارہ نحس سمجھا جاتا تھا۔

اُسی زمانہ میں لوگوں نے اکثر دیکھا تھا کہ نیوٹن اپنے مکان کے صحن میں کھڑا سورج کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ اُس نے مکان کی چھت اور دیواروں پر لکڑی کی کیلیں گاڑ کر ایک دھوپ گھڑی بنا رکھی تھی تاکہ اُن کے سایہ سے وقت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ کہتے ہیں کہ کچھ برسوں کے بعد نیوٹن کی گھڑی اتنا درست وقت بتانے لگی تھی کہ لوگ اُسے دیکھ کر وقت معلوم کر لیتے تھے۔ غالباً اُسی زمانہ میں اُس نے اپنے مکان کی دیواروں پر دو اور گھڑیاں بنائی تھیں۔ ان میں سے ایک گھڑی آج بھی رائل سوسائٹی کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔

نیوٹن کو نقّاشی کے کام میں بھی بہت مہارت حاصل تھی۔ اس کا کمرہ تصویروں سے سجا ہوا تھا۔ اُن میں سے بعض تو چھپی ہوئی تصویروں سے نقل کی گئی تھی اور کچھ خود نیوٹن کی اُتاری ہوئی تھیں۔ سب تصویریں فریم شدہ تھیں اور ان میں سے اکثر بادشاہوں اور مشہور لوگوں کی تصویریں تھیں۔ ان میں چھڑیوں، جانوروں اور

جہازوں کی تصویریں بھی تھیں۔ اور ریاضی کے نقشے بھی تھے۔ جو دیواروں پر کوئلہ سے کھنچے ہوئے تھے۔۔۔
۱۷۱۱ء میں جب اُس کا مکان ڈھایا جا رہا تھا تو یہ تصویریں اُس وقت بھی دیواروں پر بنی ہوئی تھیں۔ نیوٹن کہا کرتا تھا کہ وہ شاعر بھی ہے اور شعر کہنے کی اُس میں زبردست صلاحیت موجود ہے لیکن اس کی نظم کبھی دستیاب نہ ہو سکی۔ ممکن ہے وہ شعر نہ کہتا ہو صرف اُس پر شاعرانہ کیفیتیں طاری ہوتی ہوں۔ وہ سات برس تک گرینتھم میں رہا۔

نیوٹن کی عمر جب پندرہ سال کی ہوگئی تو اُس کی ماں نے اُس کو اپنی کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کے لیے بلا لیا۔ اب نیوٹن ماں کے دیئے ہوئے اناج لے کر بیچنے کے لیے اکثر گرینتھم آیا کرتا تھا۔ منڈی میں اناج بیچنا نیوٹن کے بس سے باہر تھا۔ وہ عام آدمی نہ تھا۔ لہٰذا اُس نے ایک ترکیب یہ نکالی کہ وہ اناج اور دوسری چیزوں کو اپنے ساتھ آنے والے ملازم کے حوالے کر دیتا کہ وہ جا کر اُسے بازار میں بیچ آئے اور خود اُس مکان میں چلا جاتا جہاں وہ پہلے رہا کرتا تھا۔ یہاں اُس کی پُرانی کتابیں تھیں جن کے مطالعے میں وہ اپنا وقت گزارتا تھا۔ ہاں... نیوٹن کو مطالعے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ جب اُس کی ماں اُسے کھیت میں بھیڑوں اور بیلوں کی حفاظت کے لئے بھیجتی تھی تو وہاں بھی نیوٹن کسی درخت کے نیچے کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور پڑھتا رہتا تھا۔ یا پھر چاقو سے زمین پر شکلیں بنایا کرتا یا رہٹ کو دیکھا کرتا تھا۔

نیوٹن کی ماں کی شدید خواہش تھی کہ اس کا بیٹا ایک اچھا کسان بن جائے، لیکن نیوٹن کی سرگرمیوں کو دیکھ کر اُسے دن بدن مایوسی ہوتی جا رہی تھی اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اُس کے بیٹے کے نصیب میں کسان بننا نہیں لکھا۔ نیوٹن کے چچا ذہین آدمی تھے جب انہوں نے دیکھا کہ اُن کا بھتیجا کھیتی باڑی میں دلچسپی لینے کے بجائے جھاڑی کے نیچے بیٹھا ہوا ریاضی کے سوالات حل کیا کرتا ہے تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ نیوٹن کو پھر گرینتھم اسکول میں بھیجا جائے۔ اس کے بعد نیوٹن کو ٹرنٹی کالج کیمبرج میں بھیجا گیا۔ نیوٹن کی ذہانت اس کالج میں آکر کھلی۔

ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلے کے بعد اُس نے منطق، علم ہیئت، الجبرا اور دوسرے علوم پر دسترس حاصل کی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اُس نے ستاروں، سیاروں اور کائنات اور فطرت کے اصولوں پر غور کرنا شروع کیا۔ اور پھر وہ واقعہ پیش آیا جس نے نیوٹن کے نام کو سائنس کی دنیا میں زندۂ جاوید کر دیا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ اس سے پہلے ہی واقف ہیں۔ جب اُس نے باغ میں سیب کو زمین پر گرتے دیکھا تو اس کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ آخر سیب زمین ہی پر کیوں گرا۔ اوپر کیوں نہ چلا گیا؟ اسی

غور و فکر کے نتیجے میں اُس نے کششِ ثقل کا قانون دریافت کیا۔ اگرچہ دوسرے سائنسدانوں کو بھی معلوم تھا کہ ایک قوتِ ثقل ضرور موجود ہے جو اشیاء کو زمین کی طرف کھینچتی ہے اور آسمانی کرّوں کے درمیان بھی موجود ہے لیکن جب تک نیوٹن نے طویل تحقیقاتی مقالے شائع نہیں کرا دیئے اس قوت کے صحیح صحیح قوانین لوگوں کو معلوم نہ ہوئے۔ اُس نے نور و رنگ کے متعلق بھی تجربے کیے اور اس سلسلے میں ایک عکس انداز دُوربین تیار کی جس کی وجہ سے اس کو سائنسدانوں میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی اور وہ صرف ۲۹ سال کی عمر میں رائل سوسائٹی کا ممبر منتخب ہوگیا۔ ۱۷۰۳ء میں وہ اس سوسائٹی کا صدر مقرر ہوا۔ اور وفات تک اس کا صدر رہا۔ چونکہ نیوٹن کا بچپن محنت و مشقت میں گزرا تھا اسی لیے اُس کے دل میں ایسے لوگوں کے لیے بڑی ہمدردی پائی جاتی تھی جو سائنسی تحقیقات میں دلچسپی رکھتے تھے، لیکن جن کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ وہ رائل سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے ایسے موجدوں اور سائنسدانوں کی دل کھول کر مالی امداد کیا کرتا تھا۔

نیوٹن کی زندگی پر غور کرو تو اُس کی ترقی کا راز ایک ہی لفظ میں نظر آتا ہے "غور و فکر"۔ اسی غور و فکر سے اُس نے سائنس کی دنیا میں کمال حاصل کیا۔

اسکول میں سب سے پیچھے رہنے والا یہ لڑکا صرف اپنے سوچنے کی قوت کے ذریعے ایک سائنسدان کی حیثیت سے ساری دُنیا میں مشہور ہوا۔ نیوٹن کا انتقال ۲۷، مارچ ۱۷۲۷ء کو ہوا۔ مرنے کے بعد اُسے ویسٹ منسٹر میں دفن کیا گیا۔ موت سے تھوڑے دن پہلے نیوٹن نے ایک عجیب بات کہی۔ اُس نے کہا۔

"میں نہیں جانتا کہ دنیا مجھے کیا سمجھے گی مگر میں اپنے آپ کو اس بچے سے زیادہ نہیں سمجھتا جو سمندر کے کنارے پر بیٹھا کھیل رہا ہے اور کبھی کبھی وہاں سے کوئی چکنا پتھر یا خوبصورت گھونگھا اُٹھا کر اپنا دل بہلا لیتا ہے اور حقیقت میں اُسے دریا کی تہہ کا حال معلوم نہیں ہوتا۔"

یہ نیوٹن کی انکساری تھی کہ تاریخ عالم کے چند ایک عظیم سائنسدانوں میں شامل ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایسا سمجھتا تھا اور یہ انکساری دنیا کے ہر بڑے آدمی میں ہوتی ہے۔

وہ کائنات کے بارے میں جتنا غور کرتا جاتا ہے اتنا ہی اپنے آپ کو لاعلم پاتا ہے۔ اس سے اُس کے اندر انکساری اور خاکساری پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر نیوٹن چھوٹا آدمی ہوتا تو وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے سینہ تان کر کہتا۔

"لو بھئی میں نے تو کائنات کا معمہ ہی حل کر دیا ہے۔"

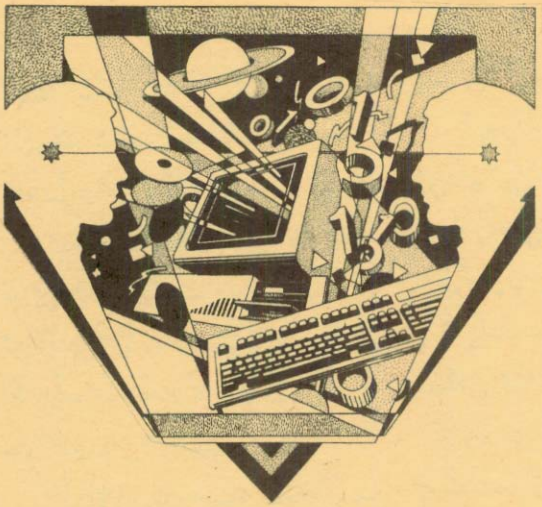

سائنس انکوائری

سائنسی موضوعات پر
آپ کے سوالات اور ان کے جوابات

سید ایاز محمود

سائنس انکوائری ماہنامہ آنکھ مچولی کا ایک مقبول سلسلہ ہے جس میں ہر ماہ سائنس کے حوالے سے ساتھیوں کے سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے۔ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سلسلے میں مزید دلچسپی اور تنوع پیدا کیا جائے۔ اس لیے زیرِ نظر شمارے سے آپ کے لیے جدید ترین سائنسی ایجادات و معلومات کا سلسلہ بھی شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہر ماہ مسلم سائنسدانوں کے مختصر حالاتِ زندگی اور کارناموں سے بھی قارئین آنکھ مچولی کو باخبر رکھا جائے گا۔ آپ سے گذارش ہے کہ اگر آپ خود کسی نئی ایجاد و اختراع سے باخبر ہوں تو مکمل حوالے کے ساتھ ہمیں ارسال کیجیے تاکہ آپ کے اس سلسلے کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔ اس کے علاوہ ایسے سوالات بھیجے جائیں جو سب کی دلچسپی کے ہوں اور جن کے جواب سے ہر ایک کی معلومات میں اضافہ ہو۔

● مکڑی اپنا جال کیسے بناتی ہے؟ (عامر ممتاز طور۔ پنڈ دادنخان)

مکڑی کے پیٹ میں مختلف غدود ہوتے ہیں جن میں ایک طرح کا ریشمی مادّہ ہوتا ہے۔ مکڑی اسی ریشمی مادّے سے اپنا جالا بنتی ہے۔

مکڑی کا جالا اس کا گھر بھی ہوتا ہے اور شکارگاہ بھی۔ آپ نے مکھی اور مکڑے والی نظم تو ضرور پڑھی ہوگی۔ یہ نظم ہمارے پیارے شاعر علامہ اقبال نے خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی ہے۔ اس کو پڑھیے۔ کیسے مکڑی نے مکھی کو اپنے جال میں پھنسایا۔

مکڑی کے جالے کو کبھی انگلی سے چھو کر دیکھیں یہ چپچپے اور لیس دار تاروں سے بنا ہوا ہوتا ہے۔

کوئی کیڑا اس میں پھنس جائے تو پھر نکل نہیں سکتا۔ مکڑی پہلے تو اپنے زہریلے ڈنک سے کیڑے کو ہلاک کرتی ہے اور پھر اُسے اپنی خوراک بنالیتی ہے۔

جب کبھی مکڑی کو اوپر سے نیچے آنا ہو تو وہ اپنے جسم میں موجود ریشمی مادّے سے ایک نہایت باریک سا تار بناتی ہوئی اس کی مدد سے نیچے اُتر جاتی ہے۔ تار اتنا باریک ہوتا ہے کہ نظر نہیں آتا۔ اور یوں لگتا ہے کہ مکڑی ہوا میں معلق ہے۔

مکڑی کا جالا بظاہر بہت نازک سا نظر آتا ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں یہ خاصا مضبوط ہوتا ہے۔ اور تند و تیز ہوا اور بارش کا بخوبی مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

● سمندروں کی گہرائی کیسے ناپی جاتی ہے؟

(مہ ناز، وجیہ ناز - نارتھ کراچی)

سمندروں کی گہرائی کو ناپنے کے لیے ایک آلہ استعمال کیا جاتا ہے جسے سونار Sonar کہتے ہیں یہ ساؤنڈ نیوی گیشن رینجنگ Sound Navigation Ranging کا مخفف ہے۔ اس آلے کی مدد سے سمندر کی سطح پر سے۔ جہاں گہرائی ناپنا مقصود ہو ایک خاص طریقے سے آواز کی لہریں پیدا کی جاتی ہیں۔ یہ آواز کی لہریں سمندر کی تہہ تک پہنچنے اور واپس سطح آب پر آنے تک کے وقت کو ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ اب اگر یہ پتا ہو کہ کتنے وقت میں کتنا فاصلہ طے ہُوا تو گہرائی کا پتا چلانا کیا مشکل ہے۔

آپ کی دلچسپی کے لئے ہم یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ گہرا ترین سمندر فلپائن کے قریب بحرالکاہل میں ماریانا کھائی کے مقام پر دریافت کیا گیا ہے۔ اس کی گہرائی ۳۵ ہزار آٹھ سو فٹ ہے۔

پُرانے زمانے میں سمندر کی گہرائی ناپنے کے لئے ڈوری میں وزن باندھ کر اُسے بتدریج نیچے اُتارا جاتا۔ یہاں تک کہ سمندر کی تہہ آجاتی۔ ڈوری پر لگے ہوئے انچوں اور فٹوں کے نشانات سے گہرائی ناپی جاتی۔ یہ طریقہ ظاہر ہے کہ زیادہ گہرے مقامات کے لئے رائج نہیں ہوسکتا۔

● گذشتہ دنوں اخبار میں یہ خبر پڑھ کر کہ سمندر کے اندر سے تیل نکالا جاسکتا ہے۔ بہت حیرت ہوئی کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے؟ حسین حقانی، منوڑہ کراچی

حسین میاں! سمندر سے تیل کا حصول اب تو پُرانی بات ہو چلی ہے اور اچھی خاصی مقدار میں تیل نکالا جارہا ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہماری دُنیا کا تین چوتھائی حصہ سمندروں پر مشتمل ہے اس حساب سے معدنیات کے بیشتر ذخائر تو سمندروں میں ہی پوشیدہ ہیں۔ وہ وقت دُور نہیں جب ہماری خوراک اور توانائی کا انحصار سمندر پر ہوگا۔

سمندر میں تیل نکالنے کے لیے پہلے زیر آب

سمندر میں تیل کی تلاش کے دو مختلف مناظر

ایسی چٹانوں کا سُراغ لگایا جاتا ہے جہاں تیل کی موجودگی متوقع ہو۔ اس کے بعد سطحِ آب پر ایک بہت بڑا پلیٹ فارم بنایا جاتا ہے۔ جو کہ نہایت مضبوطی کے ساتھ سمندر کی تہہ میں جما ہوا ہوتا ہے۔ اس پلیٹ فارم سے متعدد مقامات سے بورنگ کی جاتی ہے اور یوں پائپوں کے ذریعے تیل حاصل کیا جاتا ہے۔ یہاں تیل لے جانے والے سمندری جہاز ہر وقت موجود رہتے ہیں اور اُن میں تیل بھر کر خشکی پر لے جایا جاتا ہے۔

یہ تمام مراحل آسان نہیں۔ سمندر کی تندوتیز لہروں کی زد پہ بنے ہوئے پلیٹ فارم کو طوفانی موجوں اور آندھیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا اس کی مضبوطی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور اس کی تعمیر میں کروڑوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔

● سونا کیا ہے؟ (محمد اعجاز خان بابو زئی۔ کوٹری۔ ضلع دادو)

یہ ایک پیلی اور قیمتی دھات ہے۔ اس پر آسانی سے زنگ نہیں لگتا۔ اور نہ ہی کسی دوسری کیمیاوی اشیا اس پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ اسی وجہ سے سونے کے زیورات سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی خراب نہیں ہوتے۔ سونا لوچ دار ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کو کوٹ کر باریک باریک ورق بنائے جا سکتے ہیں یہ اتنے باریک ہوتے ہیں کہ ان سے نہایت آسانی سے روشنی گزر جاتی ہے۔

● سائنس کا مضمون رکھنے کے کیا فائدے ہیں؟ اس سے ہم کون کون سے شعبے میں آگے بڑھ سکتے ہیں؟ (محمد سلمان احمد۔ سیالکوٹ۔ طارق علوی راولپنڈی)

پاکستان میں نویں جماعت میں داخل ہونے سے قبل طلبا کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں کیا

بننا چاہتے ہیں۔ اگر وہ سائنس پڑھنا چاہتے ہیں تو "سائنس گروپ" میں انہیں داخلہ مل جاتا ہے میٹرک کر کے انٹر میں آنے کے بعد ڈاکٹر بننے کی صورت میں "پری میڈیکل" میں داخلہ لینا پڑتا ہے، جس میں بائیولوجی، فزکس اور کیمسٹری پڑھنا پڑتی ہے۔ اچھے نمبروں سے امتحان پاس کر کے میڈیکل کالج میں داخلہ مل جاتا ہے۔ انجینئر بننے کے خواہش مند طلبا انٹر میں "پری انجینئرنگ" میں داخلہ لیتے ہیں جس میں حساب فزکس اور کیمسٹری کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہونے کی صورت میں انجینئرنگ کالج یا انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل جاتا ہے۔ بہت سے طلبا یا ڈاکٹر یا انجینئر بننا نہیں چاہتے وہ بی ایس سی کا امتحان پاس کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتے ہیں اور فزکس، کیمسٹری، ریاضی، ارضیات، نباتیات، حیاتیات، بائیو کیمسٹری جینیٹکس، فلکیات وغیرہ میں ایم ایس سی کرتے ہیں جہاں تک تعلق ہے کسی مضمون کے فائدے کا۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ آج کا دور اسپیشلائزیشن کا دور ہے۔ آپ کسی بھی مضمون میں جتنا بڑھ لیں گے ترقی کے مواقع اتنا ہی آپ کے منتظر رہیں گے۔

● آسمان پر کبھی کبھار تارے ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح ٹوٹتے ہیں کیا ان سے ہماری زمین پر بھی کوئی اثر پڑتا ہے ؟

(حمیدہ کھوڑو۔ لاڑکانہ)

زمین کے مدار میں چھوٹے بڑے مختلف اجسام مسلسل گردش کرتے رہتے ہیں۔ یہ اجسام کہاں سے آئے ؟ اس کے بارے میں کوئی قطعی بات تو نہیں معلوم البتہ گمان یہ ہے کہ یہ کسی ایسے سیارے کا ملبہ ہے جو آج سے اربوں سال پہلے کسی حادثہ کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

ان اجسام کو زمین کی کشش ثقل اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ کبھی کبھار ایسا کوئی جسم اپنے مدار سے ہٹ کر زمین کی طرف کھنچا چلا آتا ہے اور بالآخر زمین پر گر جاتا ہے۔

ہماری زمین پر ۶۰۰ میل تک ایک فضائی غلاف ہے۔ اسی فضا میں ہم سانس لیتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ خلا سے جب کوئی بھی جسم زمین کے فضائی غلاف میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے تو شدید ترین رگڑ سے اس میں آگ لگ جاتی ہے۔ اور وہ گیس بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ایسے اجسام کو ہم شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ جس عمل کو آپ تاروں کا ٹوٹنا کہتے ہیں وہ دراصل جلتے ہوئے شہاب ثاقب ہیں۔ اگر یہ زمین کی فضا میں ہی نہ جل جائیں تو اُن کے زمین پر گرنے سے بڑی تباہی ہو۔ چاند پر چونکہ کوئی فضائی غلاف نہیں ہے اس لیے وہ وہاں شہاب ثاقب کی بارش ہوتی رہتی ہے اسی لیئے چاند ہمیں داغ دار نظر آتا ہے۔ شہاب ثاقب مٹی، پتھر اور مختلف دھاتوں کے ہو سکتے ہیں۔

ریچھ ہے یا...؟

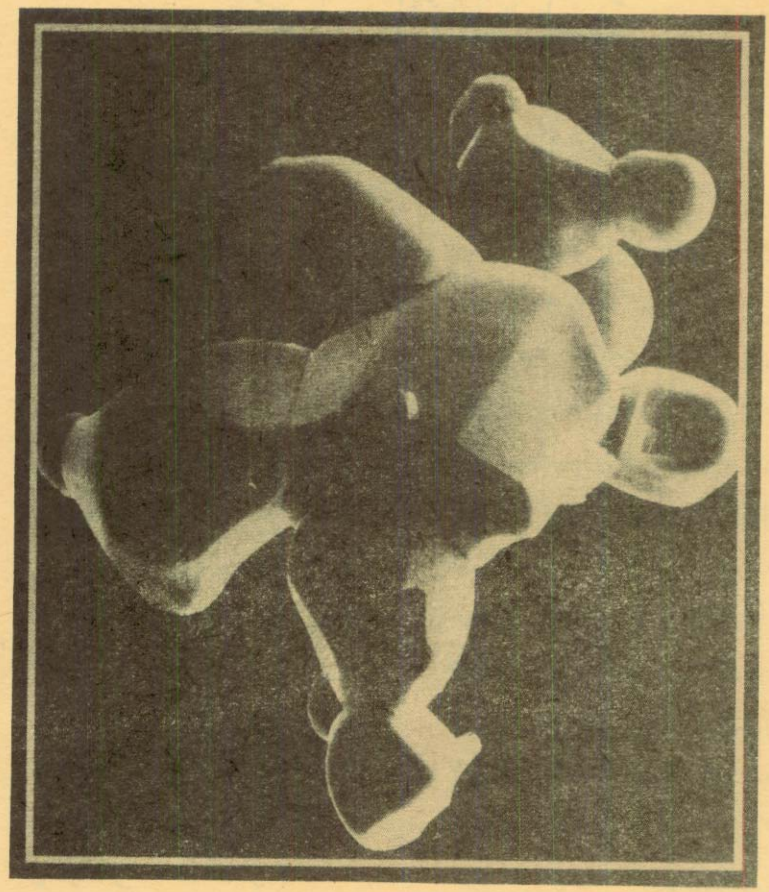

اس ریچھ کے بچے کو آپ روزانہ اپنے ٹی وی اسکرین پر دیکھتے ہوں گے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ کوئی اداکار نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ فاسفر کا ایک دھبہ ہے۔ رنگین ٹی وی کی اسکرین پر فاسفر کا رنگ ہوتا ہے۔ اسی فاسفر کے کروڑوں ذرے، ٹی وی کے آن ہونے پر سرخ، نیلا، یا سبز رنگ دھار لیتے ہیں۔ فاسفر کے ذرّوں کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ یہ ذرہ ٹیڈی بیئر کی ساخت کا ہے۔ اس ذرّے کو ۱۴ ہزار گنا بڑا کر کے دکھایا گیا ہے۔ ایک خاص الیکٹرونک مائیکرواسکوپ سے اس کی تصویر حاصل کی گئی ہے۔

روشنی اور آواز کا انوکھا سفر

گراہم بیل کا نام سنتے ہی ذہن میں ٹیلی فون کا تصور آتا ہے مگر آپ کو شاید یہ نہ معلوم ہو کہ خود گراہم بیل فوٹو فون کو اپنی سب سے زیادہ اہم ایجاد گردانتا تھا اور اس کو یقین تھا کہ اُس کی یہ ایجاد مستقبل میں مواصلات کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دے گی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ فوٹو فون آخر کیا بلا ہے۔ تو بھئی یہ یونانی زبان کے الفاظ فوٹو یعنی روشنی اور فون بمعنی آواز کا مجموعہ ہے۔ ٹیلی فون تو آواز کی لہروں کو برقی رو میں تبدیل کر کے فاصلہ تک پہنچاتا ہے۔ جبکہ فوٹو فون میں آواز سورج کی روشنی کے ساتھ سفر کرتی ہے۔

فوٹو فون کے اس اصول کا تجربہ گراہم بیل نے نہایت کامیابی کے ساتھ کیا۔ اس کے لئے وہ ایک ایسے آئینے کے قریب جا کر کچھ الفاظ بولتا جو سورج کی روشنی منعکس کر رہا ہوتا تھا۔ اس کی آواز کے ارتعاش یا اُتار چڑھاؤ سے آئینہ مرتعش ہوتا اور اس کے نتیجے میں اس سے منعکس ہونے والی روشنی میں بھی ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ یہ روشنی فاصلہ پر رکھے ہوئے ریسیور میں موصول ہوتی۔ جہاں اُسے برقی اشاروں کو پھر سے آواز میں تبدیل کر دینے اور یوں سورج کی روشنی کی وساطت سے آواز اپنا سفر طے کرتی۔ یہ تھا فوٹو فون کے کام کرنے کا اصول۔

گراہم بیل اپنی اس ایجاد کو مستقبل کی ایجاد قرار دیتا تھا۔ زمانہ جدید میں بصری ریشوں ــــــــــ OPtical Fibers ــــــ کی دریافت نے اس بات کو درست ثابت کر دکھایا ہے۔ بصری ریشوں کا نام سن کر گھبرائیے نہیں یہ وہ ریشے نہیں جو تخمی آم کی گٹھلی چوستے ہوئے آپ نے دیکھے ہوں گے۔ اور نہ ہی یہ اون اور پٹ سن وغیرہ کے ریشے ہیں۔ یہ دراصل نہایت شفاف شیشے کی بے حد باریک نلکیاں ہیں۔ جن میں لیزر روشنی کے ذریعے آواز کی ترسیل کا کام با آسانی لیا جا سکتا ہے۔ فوٹو فون میں گراہم بیل نے سورج کی روشنی سے آواز کی لہروں کو سفر کروایا تھا، یہاں سورج کی روشنی کی جگہ لیزر کی روشنی نے لے لی ہے، لیکن بنیادی اصول وہی ہے جو فوٹو فون کا تھا۔ حال ہی میں امریکہ اور جاپان کے درمیان بحرالکاہل کی تہہ میں ۱۳ ہزار کلو میٹر طویل بصری ریشوں کی ٹیلی فون لائن بچھائی گئی ہے۔ یہ لائن بیک وقت ۴۰ ہزار کالوں کا بوجھ سنبھال سکتی ہے۔ مستقبل قریب میں یورپ اور امریکہ کے درمیان بحر اوقیانوس میں بصری ریشوں کا نظام بچھایا جا رہا ہے۔ جو کسی بھی ایک لمحے میں ۸۰، ہزار کالوں کی ترسیل کو ممکن بنا دے گا۔

روشنی، آواز کی ہمراز ہوسکتی ہے کیا؟

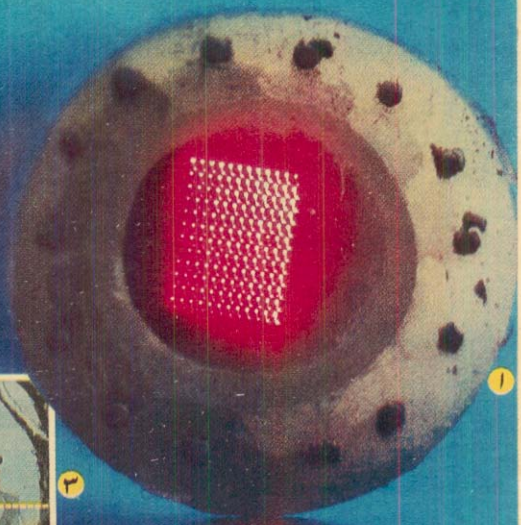

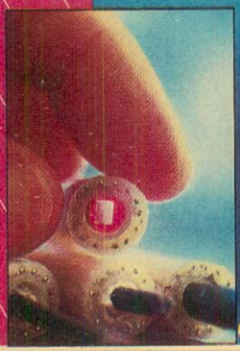

① ۱۴۴ بصری ریشوں پر مشتمل گچھا جو ۴۵۰۰۰ ٹیلی فون کالیں ارسال کر سکتا ہے۔

② دو انگلیوں کے درمیان سما جانے والا بصری ریشوں کا چھوٹا سا کیبل جس میں مواصلاتی سیارے سے زیادہ کالوں کی گنجائش ہے۔

③ گراہم بیل روشنی کی آواز سُننے کا تجربہ کرتے ہوئے۔

④ ڈزنی ورلڈ میں ماہرین بصری ریشوں کا نظام نصب کر رہے ہیں۔

لہراتی بل کھاتی چیزیں کیا کیا ہیں بتلاؤ؟

کتنی عجیب بات ہے کہ چیزوں کی شناخت یا تو بہت زیادہ فاصلے سے نہیں ہو سکتی اور یا پھر ان کے اتنے قریب آجانے سے جہاں تمام فاصلے سمٹ جائیں ... یہ تصاویر بھی ایسی چیزوں کی ہیں جنہیں آپ آئے دنوں دیکھتے ہیں... غور سے دیکھئے اور بتائیے کہ یہ کن چیزوں کی تصاویر ہیں... ؟

احسان فراموش آدمی

شاہنواز فاروقی

بعض لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں

بہت برسوں پہلے کسی گاؤں میں ایک غریب شخص رہا کرتا تھا۔ وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔ مگر بہت تلاش کے باوجود اُسے کوئی ڈھنگ کا کام نہیں مل پایا۔

غریبی سے تنگ آکر اُس شخص نے اپنے گاؤں سے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔

دوسرے دن اپنے بیوی بچّوں کے جاگنے سے قبل ہی وہ گھر سے نکل پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک گھنے جنگل میں جا پہنچا۔ وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ بھوک پیاس سے اُس کا حال بُرا تھا۔ پیاس بجھانے کے لیے وہ پانی تلاش کرنے لگا۔ آخر کار اُسے ایک کنواں دکھائی دیا۔ اس نے کنویں کے پاس جا کر کنویں کے اندر جھانکا۔ تو دیکھا کہ کنویں کے اندر ایک شیر، ایک بندر، ایک سانپ اور ایک آدمی گرا ہوا ہے۔

غریب شخص پر نظر پڑتے ہی شیر نے کہا "او بھلے آدمی برائے مہربانی مجھے اِس کنویں سے نکال۔ میرے بچّے گھر پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ مجھ پر رحم کھاؤ اور مجھے کنویں سے باہر کھینچ لو۔۔۔"

غریب آدمی نے کہا: "تم کو باہر کھینچ لوں! یعنی ایک شیر کو بچایا یا نہ۔ تمھارا کیا بھروسہ! ممکن ہے تم

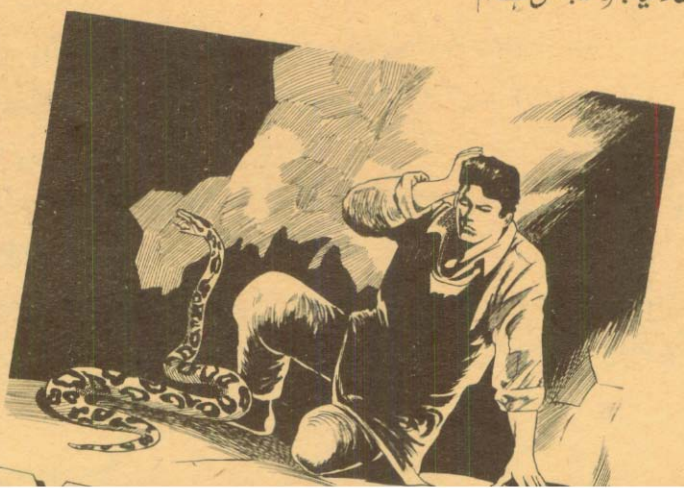

مجھے کنویں سے نکلتے ہی کھا جاؤ۔"

"بھلے آدمی مجھ سے مت ڈرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" شیر نے غریب آدمی کی منّت کی۔

غریب آدمی کو شیر پر رحم آگیا۔ پھر اُس نے یہ بھی سوچا کہ انسان کو ہر حالت میں نیکی کی طرف مائل رہنا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے شیر کو کنویں سے باہر نکال لیا۔

شیر نے کنویں سے نکل کر غریب آدمی کا شکریہ ادا کیا اور تھوڑے فاصلے پر موجود پہاڑ کی جانب اشارہ کرکے کہا۔

"میں وہاں ایک غار میں رہتا ہوں، کبھی ضرورت ہو تو میرے پاس ضرور آئیے گا۔"

اُسی وقت کنویں کے اندر سے بندر نے بھی پکارا۔

"اے فرشتہ صفت انسان! برائے مہربانی مجھے بھی باہر نکال لے۔"

غریب آدمی نے بندر کو بھی کنویں سے باہر نکال لیا۔

بندر نے کنویں سے باہر آتے ہی غریب آدمی کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔

"اگر کبھی آپ کو پھل فروٹ کھانے کی خواہش ہو تو خادم کو بتائیے گا۔ میرا گھر پہاڑی کے نیچے ہے۔"

تبھی کنویں کے اندر سے سانپ نے صدا لگائی۔

"برائے مہربانی مجھ پر بھی رحم کھاؤ۔"

غریب آدمی نے چونک کر کہا۔ "تمہیں؟ تم تو سانپ ہو، کہیں مجھے ڈس لیا تو؟"

سانپ نے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں نہیں کاٹوں گا۔ بھلا اپنے بچانے والے کو بھی کوئی مارتا ہے۔"

غریب آدمی کو سانپ پر بھی ترس آگیا اور اُس نے اُسے بھی کنویں سے نکال لیا۔

سانپ نے غریب آدمی کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"اگر آپ کبھی کسی مصیبت میں گرفتار ہوں تو مجھے یاد کر لیجیے گا۔ آپ جہاں بھی ہوں گے میں آپ کی مدد کے لیے چلا آؤں گا۔ اور جیسے بن پڑے گا آپ کے کام آؤں گا۔"

پھر شیر، بندر اور سانپ نے غریب آدمی سے اجازت چاہی۔ جانے سے پہلے سب نے غریب آدمی کو کنویں میں موجود شخص کے بارے میں خبردار کیا۔ ایک نے کہا۔ "اس شخص کی ہرگز بھی مدد نہ کیجیے گا۔"

دوسرا بولا: "اگر کریں گے تو پچھتائیں گے۔"

ان تینوں کے جاتے ہی کنویں کے اندر گرے ہوئے شخص نے چلّانا شروع کر دیا اور گڑگڑا کر باہر نکالنے کی درخواست کرنے لگا۔ غریب آدمی کو رحم آگیا اور اُس نے اُسے بھی کنویں سے باہر کھینچ لیا۔

اُس آدمی نے کنویں سے باہر آکر غریب آدمی کا شکریہ ادا کیا۔ اور بولا۔

"میں ایک سُنار ہوں۔ پاس کے شہر میں رہتا ہوں۔ کبھی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میرے پاس ضرور تشریف لائیے گا۔" اتنا کہہ کر سُنار اپنی راہ پر چل دیا۔

غریب آدمی روزگار کی تلاش میں ایک بار پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ کئی روز تک مارا مارا پھرتا رہا مگر کام نہ مل کر دیا۔ وہ بہت مایوس ہو گیا۔ اچانک اُسے شیر، بندر، سانپ اور سنار کی یاد آئی۔ اس نے سوچا کیوں نہ اُن سے مل کر دیکھ لیا جائے۔

سب سے پہلے وہ بندر کے پاس گیا۔ بندر نے زبردست طریقے سے غریب آدمی کا استقبال کیا۔ اُس نے غریب آدمی کے سامنے طرح طرح کے ڈھیروں پھل فروٹ لا کر رکھ دیے۔ غریب آدمی نے جی بھر کر پھل کھائے۔ پھر اُس نے بندر کا شکریہ ادا کیا اور شیر کے گھر کا پتہ پوچھا۔ اب وہ شیر کو آزمانا چاہتا تھا۔ بندر نے اُسے شیر کے گھر کا راستہ بتا دیا۔

غریب آدمی کو دیکھتے ہی شیر بہت خوش ہوا۔ وہ اپنے بچانے والے کو نہیں بھولا تھا۔ شیر نے غریب آدمی کو سونے کے کئی قیمتی ہار دیے۔ یہ ہار اُسے ایک مُردہ شہزادے کے جسم سے ملے تھے۔ ہار پا کر غریب آدمی بہت خوش ہوا اور شیر کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھا۔

راستے میں اُس نے سوچا۔ میرا سفر کامیاب رہا۔ میں اب ان ہاروں کو اچھے داموں فروخت کر کے گھر لوٹ جاؤں گا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مزے سے رہوں گا۔ مگر ہاروں کو فروخت کہاں کیا جائے؟ تبھی اُسے سُنار کا خیال آیا۔ وہ سیدھا سُنار کے گھر کی طرف چل پڑا۔

غریب آدمی کو دیکھ کر سنار بہت خوش ہوا اور اُس نے اُس کے آنے کی وجہ پوچھی۔ غریب آدمی نے کہا۔

"میں آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ دراصل میرے پاس کچھ قیمتی ہار ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اُن کی فروخت میں میری مدد کریں۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں!" سنار نے کہا اور غریب آدمی سے ہار لے کر دیکھنے لگا۔ سنار تھوڑی دیر تک ہاروں کی پرکھ کرتا رہا، پھر بولا۔

"کیا ہی اچھا ہو اگر ہم ان ہاروں کی فروخت سے پہلے کسی دوسرے سنار سے بھی مشورہ کر لیں۔ آپ یہیں آرام کیجیے میں ابھی ذرا سی دیر میں اپنے ایک دوست سنار سے ان ہاروں کی قیمت کے بارے میں رائے لے کر آتا ہوں۔"

جاتے جاتے سنار نے اپنی بیوی کو مہمان کی ٹھیک طرح دیکھ بھال کرنے کو کہا اور پھر باہر چلا گیا۔

ہار لے کر سنار سیدھا بادشاہ کے محل پہنچا اور اُس نے بادشاہ سے ملاقات کر کے اُسے غریب آدمی کے لائے ہوئے ہار دکھائے۔ اُس نے بادشاہ سے کہا۔

"جناب عالی! یہ وہی ہار ہیں جو میں نے شہزادے کے لیے بنائے تھے۔ ایک آدمی ابھی ابھی ان ہاروں کو میرے پاس فروخت کرنے کے لیے لایا ہے۔ میں اُسے اپنے گھر بٹھا کر یہ ہار آپ کو دکھانے آیا ہوں۔"

بادشاہ یہ خبر سنتے ہی غصّے سے آگ بگولہ ہو گیا اور اُس نے فوراً سپاہیوں کو حکم دیا کہ سنار کے گھر سے اُس آدمی کو پکڑ لائیں جس نے کچھ دنوں قبل شہزادے کو موت کے گھاٹ اُتار کر یہ ہار حاصل کیے ہیں۔

بادشاہ کا حکم سنتے ہی کئی سپاہی فوراً سنار کے گھر پہنچے اور غریب آدمی کو گرفتار کر لائے۔ بادشاہ نے حکم دیا: "اِسے قید خانے میں ڈال دو۔ ہم اس کی سزا کا فیصلہ کل کریں گے۔"

بے چارے غریب آدمی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ اُسے کیوں گرفتار کیا گیا۔ قید خانے میں بند ہونے کے تھوڑی دیر بعد اُس نے وہاں کے پہرے دار سے پوچھا۔

"بھائی کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا؟"

"اس لیے کہ تم نے شہزادے کو موت کے گھاٹ اُتار کر اُس کے ہار لوٹے ہیں۔ تمہارے اس جُرم کی سزا موت سے کم نہ ہو گی۔" پہرے دار نے جواب دیا۔

پہرے دار کی بات سُن کر غریب آدمی بھونچکا رہ گیا۔ موت کی سزا کا سُن کر تو وہ خوف سے کانپنے لگا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

غریب آدمی کو قید خانے میں آئے ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ اُسے سانپ کی یاد آئی۔ اُس نے فوراً سانپ کو آواز دی۔ سانپ پکارتے ہی اُس کے پاس آ گیا۔

غریب آدمی نے سانپ کو ساری بات بتائی۔ اُس نے سانپ کو بتایا کہ "وہ بے گناہ ہے۔"

غریب آدمی کی کہانی سُن کر سانپ سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔

"تمہارے بچنے کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔"

"کیا؟" غریب آدمی نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں چپکے سے رانی کے کمرے میں جاؤں گا اور اُسے کاٹ لوں گا۔ میرے زہر سے رانی بے ہوش ہو جائے گی۔ پھر چاہے کوئی کیسا ہی علاج کرے اُسے ہوش نہیں آئے گا۔"

"پھر کیا ہوگا؟" غریب آدمی نے سانپ کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرے زہر کا اثر اُس وقت تک رہے گا جب تک تم اپنے ہاتھوں سے رانی کا ماتھا نہیں چھوؤ گے" سانپ نے یہ کہا اور رانی کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ سانپ نے رانی کو کاٹا اور تیزی سے کمرے سے نکل بھاگا۔ سانپ کے کاٹتے ہی رانی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

رانی کے بے ہوش ہوتے ہی محل میں کہرام برپا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی۔

بادشاہ نے ملک کے تمام بڑے بڑے حکیموں کو بلایا مگر کوئی بھی رانی کو ہوش میں نہ لا سکا۔

تھک ہار کر بادشاہ نے پورے ملک میں منادی کرادی کہ جو رانی کو اچھا کرے گا اُسے انعام دیا جائے گا۔"

یہ خبر قید خانے میں غریب آدمی تک بھی پہنچی تو اُس نے پہرے دار سے کہا

"مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو۔ میں رانی کی بے ہوشی دُور کر سکتا ہوں۔"

پہرے دار غریب آدمی کو بادشاہ کے سامنے لے گئے۔ بادشاہ غریب آدمی کو لے کر فوراً بے ہوش رانی کے کمرے میں پہنچا۔ رانی اُس وقت اپنے بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ سانپ کے زہر نے اُس کا سارا جسم نیلا کر دیا تھا۔

غریب آدمی آگے بڑھا اور اُس نے رانی کے ماتھے کو چھُوا۔ غریب آدمی کے چھُوتے ہی رانی اُٹھ بیٹھی۔ اُس کے جسم کا نیلا پن جاتا رہا۔

بادشاہ نے رانی کو ہوش میں دیکھا تو بے حد خوش ہُوا۔ بادشاہ نے غریب آدمی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"اے بھلے آدمی تم کون ہو؟ اور تمھیں قید خانے میں کیوں رکھا گیا ہے۔؟"

غریب آدمی نے بادشاہ کو گھر چھوڑنے سے لے کر جیل میں بند ہونے تک کی ساری کہانی سنائی۔

غریب آدمی کی کہانی سُن کر بادشاہ کو سنار پر بڑا غصّہ آیا۔ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس احسان فراموش آدمی کو فوراً پکڑ کر اُسے کڑی سزا دی جائے۔ بادشاہ کو بھولے بھالے غریب آدمی کو سزا دینے پر بہت دکھ ہوا۔ بادشاہ نے غریب آدمی کو بہت سا انعام دے کر رخصت کیا۔

اس کے بعد غریب آدمی اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ مزے میں رہنے لگا۔

آپ کی جدّوجہد

شاھنواز فاروقی

(آرتھر ھیوگلو کی نظم سے ماخوذ)

مت کہیں ہرگز کہ ہے جدّوجہد بے فائدہ
مت کہیں ہرگز کہ محنت کا نہیں ملتا صلہ

مت کہیں یہ بھی کہ دشمن آپ کا ہارا نہیں
مشکلوں میں آپ کی آئی نہیں کوئی کمی

جس طرح دیتی ہیں دھوکہ ساری امّیدیں کبھی
ہو سراب اُس طرح سے ہی ہارنے کا خوف بھی

عین ممکن ہے کہ کچھ حالات کا گردوغبار
بَن گیا ہو آپ کی آنکھوں کے آگے کوہسار

عین ممکن ہے کہ اس کہسار کے دُوجی طرف
بَن رہا ہو آپ کا دُشمن شکستوں کا ہدف

آپ کے احباب ہوں دُشمن کو گھیرے میں لئے
منتظر ہوں اور وہ ہر دَم یقینی جیت کے

ناکام ہو سکتی نہیں

چُوم کر ساحل کو دھیرے سے چلی جاتی ہیں جو
ایسے جیسے وہ رہی ہوں ریت کے ساحل کو دھو

آپ کو معلوم ہے ہوتی ہیں یہ لہریں وہی
جو کہ آتی ہیں بنا کر گہری کھائی کو کہیں

اور جیسے مشرقی کھڑکی سے سورج روز ہی
ہو کے ظاہر دھیرے دھیرے بانٹتا ہے روشنی

مشرقی جانب سے سورج کو اُبھرتا دیکھ کر
ذہن میں ہوتا ہے کچھ ایسے تصوّر کا گزر

جیسے مشرق کے سوا ہر سمت تاریکی ہے، پر
دیکھتا ہے گھُوم کر جب دوسری جانب بشر

اُس کو آتی ہے نظر ہر سمت پھیلی روشنی
لمحہ لمحہ بڑھنے والی، گرم، پیلی روشنی

اِس لئے اِس بات پر رکھیں بہت گہرا یقیں
آپ کی جدّوجہد ناکام ہو سکتی نہیں

اس ماہ کے قہقہاتے لطائف

کھٹ مٹھے

"میری کامیاب حکومت کا راز" بادشاہ نے انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

"ایک معاہدہ ہے۔ جس کے تحت عوام کو وہ کچھ کہنے کی آزادی ہے جو اُن کا دل چاہے اور مجھے وہ کچھ کرنے کی جو میرا دل چاہے۔"

سید اطہر سعید کاظمی، ملتان

ایک دفعہ ایک سیاستدان تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے کہ پچھلی صف سے کسی نے اُن پر انڈا پھینکا انہوں نے فوراً بات سنبھالتے ہوئے کہا

"مجھے ان کے مہنگے ہونے کا احساس ہے۔ میں منتخب ہونے کے بعد ان کی قیمت کم کروانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

"تاکہ غریب سے غریب آدمی بھی ایک آدھ انڈا آپ پر استعمال کر سکے۔" پچھلی صف سے آواز آئی۔

محمد فہیم خان، میر پور خاص

ایک شخص نے اپنی داستانِ حیات سُناتے ہوئے کہا کہ جب میرے کان سُننے کے قابل تھے اور آنکھ کی نظر تیز تھی اور ہوش و حواس صحیح تھے تو میں کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ لیکن جب سے کانوں نے سُننا چھوڑا ہے اور آنکھوں کی نظر کمزور ہوئی ہے۔ اور ہوش و حواس جواب دے گئے ہیں۔ تو میں کرکٹ کا امپائر بن گیا ہوں اور کافی کامیاب امپائر ہوں۔"

محمد عمران احمد، فیڈرل بی ایریا کراچی

ایک عورت پڑوسن سے اپنی بیٹی کی تعریف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی"

"اس کی چال مورنی جیسی، آنکھیں ہرنی جیسی اور آواز کوئل کی طرح ہے۔" پڑوسن غور سے سنتی رہی تعریف ختم ہوئی تو بولی۔

"ارے بہن اس میں کوئی انسانوں والی خصوصیت بھی ہے یا نہیں؟"

شازیہ کلیو۔ راولپنڈی

ریل گاڑی چلی تو ایک شخص تیزی سے بھاگتا ہوا آیا اور چلتی گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ گارڈ نے لپک کر اُسے پکڑ لیا اور کہا
"کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہو۔ چلتی گاڑی میں مت چڑھو گر جاؤ گے" اتنے میں گارڈ کا آخری ڈبہ آگیا۔ گارڈ لپک کر چڑھنے لگا۔ تو اُس آدمی نے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اور بولا۔
"واہ حضرت یہ خوب رہی، دوسروں کو جس کام سے منع کرتے ہو، وہی خود کرتے ہو"

ذیشان انجم ۔ گلشن اقبال کراچی

ایک پادری اپنے بچے کو اپنی کہانی سُنا رہا تھا کہانی سُن کر بچے نے کہا "پاپا یہ واقعی سچ ہے یا آپ وعظ کر رہے تھے؟"

سیما اسحٰق ۔ رامسوامی، کراچی

برطانیہ کے مشہور سیاستدان اور وزیرِ اعظم لائڈ جارج تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو مجمع میں سے ایک شخص پکارا "اسے دیکھو، یہ تقریر کرنے چلا ہے، اس کا باپ تو گدھا گاڑی ہانکتا تھا، لائڈ نے ایک نظر اُس شخص پر ڈالی اور پُرسکون انداز میں بولے "یہ شخص ٹھیک کہتا ہے، میرا باپ مر چکا ہے اور گاڑی نہیں رہی، مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ گدھا اب بھی موجود ہے"

کامران احمد خان ۔ لیاقت آباد کراچی

"بیگم صاحبہ!" گداگر نے ایک رحم دل خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"اگر آپ نے آج مجھے پانچ روپے نہ دیے تو مجھے ایک ایسے عمل کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ جس کے تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور جسم کانپنے لگتا ہے"
خاتون نے پانچ روپے کا نوٹ گداگر کو دیتے ہوئے ازراہِ تجسس اُس سے پوچھا۔
"خدا تم پر رحم کرے، کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ میں نے تمہیں کس حادثے سے بچایا؟"
گداگر نے شکر و اطمینان کی ایک نگاہ اس نیک دل خاتون پر ڈالی اور کہا "کام کرنے سے..."

اعجاز احمد انجم، کھلابٹ ہری پور

ایک زیرِ تعمیر مسجد کے دروازے پر بڑا سا سائن بورڈ لگا ہوا تھا جس پر نمایاں الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔
"خدا کی رحمت کا یہ دروازہ آپ کو سیدھا جنت میں لے جائے گا" بورڈ کے ایک طرف گتے کا ایک ٹکڑا لٹک رہا تھا جس پر باریک الفاظ میں لکھا تھا۔
"براہِ مہربانی دروازہ زیرِ تعمیر ہے پیچھے سے تشریف لائیں"

نبیل احمد، پشاور

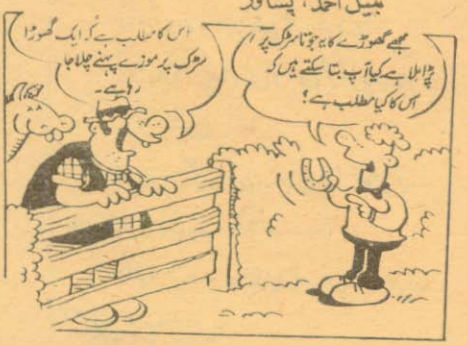

انعامی لطیفہ

ایک نواب صاحب کو جو دانشوروں کی بے حد قدر کرتے تھے ایک بہت ہی ذہین اور چالاک شخص نے بڑا مرعوب کر رکھا تھا۔ اس شخص کو ہر فن مولا ہونے کا دعویٰ تھا اور درباری اُس سے چڑتے تھے۔ انہوں نے نواب کے بہت کان بھرے مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک دن ایک عربی دان کے اعزاز میں نواب نے دعوت دی۔ ایک درباری نے ہر فن مولا سے پوچھا۔

"ٹھنڈے شوربے کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟"

ہر فن مولا پہلے تو سخت گھبرایا، پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے قہقہہ لگایا اور بھاری بھرکم آواز میں کہا: "کیوں بے وقوف بناتے ہو یار۔ عرب شوربے کو ٹھنڈا ہی کب ہونے دیتے ہیں"۔

ستارہ انجم شیخ۔ ٹنڈو آدم

ایک سیاسی لیڈر جس کا ایک کان کٹا ہوا تھا۔ ایک جلسے میں تقریر کر رہا تھا۔ اچانک اُس نے جوش میں کہا "ہم اپنے وطن کے لیے جان کی قربانی دے دیں گے" بھیڑ میں سے کسی کی آواز آئی۔

"کن کٹوں کی قربانی قبول نہیں ہوتی"۔

مہوش غنی خٹک، لاہور

ایک بہرا (دوسرے بہرے سے) "کیا تم گھر جا رہے ہو؟"

دوسرا بہرہ: "نہیں! میں گھر جا رہا ہوں"۔

پہلا بہرہ: "اچھا! میں تو سمجھا تم گھر جا رہے ہو"۔

فرخ شہزاد، ملتان

اُستاد (شاگرد سے) "ریحان بتاؤ خلوص، محبت اور مروّت میں کیا بات مشترک ہے؟

شاگرد: جناب، یہ تینوں چیزیں اب صرف کتابوں میں ملتی ہیں"۔

سیف اللہ۔ توبہ ٹیک سنگھ

جوڈو کراٹے کے ایک کلب کے باہر ایک بورڈ پر مندرجہ ذیل الفاظ تحریر تھے۔

"یہاں صرف جوڈو کراٹے کی تربیت حاصل کرنے والے ہی اپنی کاریں کھڑی کر سکتے ہیں، غیر متعلقہ افراد کی کاروں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے گا"۔

سید محمد حسن رضا نقوی، لاہور

ایک خاتون ابتدائی طبی امداد کی ٹریننگ کر رہی تھیں۔ ایک دن اُنہیں سڑک پر ایک آدمی اوندھے منہ پڑا ہوا نظر آیا۔ وہ لپک کر اُس کے پاس پہنچیں۔ اور سانس کی آمدورفت بحال کرنے کے لیے پھیپھڑوں کو دبانا شروع کر دیا۔ جب تمام اصول آزما چکیں تو اُس آدمی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اُٹھتے ہوئے بولا...

"محترمہ! آپ مجھے مین ہول میں تالا لگانے دیں

گی یا نہیں ؟"

ناھیدعظمت بیگ، ناظم آباد، کراچی

جانوروں کو انسانوں پر برتری حاصل ہے ۔ اگر کسی ریس میں بیس گھوڑے ہوں تو کم سے کم پانچ ہزار انسان انھیں دیکھنے جائیں گے ۔ لیکن کسی ریس میں بیس انسان ہوں تو ایک بھی گھوڑا انھیں دیکھنے نہیں جائے گا۔"

منیراحمد بیٹھوں ۔ جعفر آباد

ایک صاحب گھبرائے ہوئے گھر واپس آئے اور بیوی سے بولے ۔

"بیگم، میں دفتر سے آرہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا ۔۔۔ اتنے میں اُن کی ایک بچی بول اُٹھی" امی ! ثمینہ نے میری گڑیا توڑ دی ہے ۔"

بیوی نے کہا "اچھا بیٹی ، ہم تمھیں دوسری گڑیا لا دیں گے ۔"

"ہاں تو بیگم ، میں کہہ رہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا۔" شوہر نے پھر کہنا چاہا ۔

اتنے میں ان کا لڑکا بول اُٹھا "امی امی ! مجھے گڈو نے مارا ۔۔۔"

بیوی جھلا کر بولی" بھئی خدا کے لیے چُپ ہو جاؤ مجھے گدھے کی بات سُننے دو۔"

عباد علی سحر ناز ۔ ملتان روڈ لاھور

ایک بوڑھا ماسکو کے سب سے بڑے پارک میں بیٹھا عبرانی زبان کی گرامر میں سر کھپا رہا تھا کہ کے جی بی کے ایک ایجنٹ کا اُدھر سے گزر ہُوا ۔ وہ بوڑھے کے پیچھے کھڑا عبرانی کی کتاب کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے بوڑھے سے پوچھا" یہ کون سی زبان ہے ۔"

"عبرانی ہے اسرائیل میں بولی جاتی ہے" بوڑھے نے جواب دیا ۔

"تمھارے لیے اس زبان کا سیکھنا فضول ہی ہے بڑے میاں " کے جی بی کے ایجنٹ نے نفرت اور حقارت سے کہا" تمھاری زندگی کے چند سال ہی رہ گئے ہیں ۔ جیتے جی تم تو اسرائیل نہیں جا سکو گے ۔"

"ٹھیک کہتے ہو کامریڈ" ۔ بوڑھے نے پرسکون

لہجے میں کہا" مگر عبرانی زبان جنّت میں بھی بولی جاتی ہے وہاں میرے کام آئے گی"

"کیا تمھیں یقین ہے کہ تم جنت میں جاؤ گے؟"

کے جی بی کے ایجنٹ نے کہا" فرض کرو، تمہیں جہنّم میں جانا پڑے، وہاں تم کیا کرو گے؟"

"فکر کی کوئی بات نہیں کامریڈ" بوڑھے نے اطمینان سے جواب دیا" روسی زبان مجھے بہت اچھی طرح آتی ہے"

محمّد رضوان، اورنگی ٹاؤن کراچی

محکمہ تعلیم کا ایک افسر کسی دیہاتی اسکول کا معائنہ کرنے گیا۔ معائنے کے دوران اُس نے بلیک بورڈ پر لفظ "ایکٹرک" لکھا اور ایک لڑکے سے پوچھا کہ "وہ کیا لفظ ہے؟" لڑکے نے سوچ کر جواب دیا" علی کڑک"

افسر بہت غصّے ہوا اور ساتھ کھڑے ہوئے اُستاد سے بولا" آپ بتائیں کیا لفظ ہے؟"

اُستاد نے بلیک بورڈ کو گھورتے ہوئے کہا "الیکٹرک لگتا ہے سر"

ملک عامر محمود کوریہ، مظفر گڑھ

ایک دن رضوان اسکول دیر سے پہنچا تو ماسٹر صاحب نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ رضوان نے کہا" جناب مجھے دیر اس لیے ہوگئی کہ روزانہ جس راستے سے آتا تھا وہ خراب تھا۔ میں دوسری سڑک سے آرہا تھا کہ راستے میں ایک بورڈ نظر آیا" ماسٹر صاحب نے رضوان کو گھورتے ہوئے کہا" بورڈ سے تمہارے دیر سے آنے کا کیا تعلق ہے؟" وہی بتانے والا ہوں سر" رضوان نے کہا" دراصل اُس بورڈ پر لکھا تھا۔ آگے اسکول ہے آہستہ چلیں"۔ محمّد رمضان سومیانی

اعلان

اکثر قارئین اپنے لطیفوں کے ساتھ اپنا مکمل پتا ارسال نہیں کرتے جس کے باعث انعامی لطیفہ بھیجنے والے قاری کو انعام روانہ کرنے میں دقّت ہوتی ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ لطیفوں کے ساتھ اپنا مکمل پتا ارسال کریں۔ نیز جس قاری کا لطیفہ انعامی قرار پائے اور اُسے رسالہ شائع ہونے کے دس روز کے اندر انعام نہ ملے تو وہ ہمیں اپنا پتا فوراً ارسال کرے تاکہ اُسے بروقت انعام روانہ کیا جا سکے۔ (ادارہ)

مولاجٹ کے ہمسائے

اللہ ایسے ہمسایوں سے ہم سب کو بچائے

محمد افضل شاہین

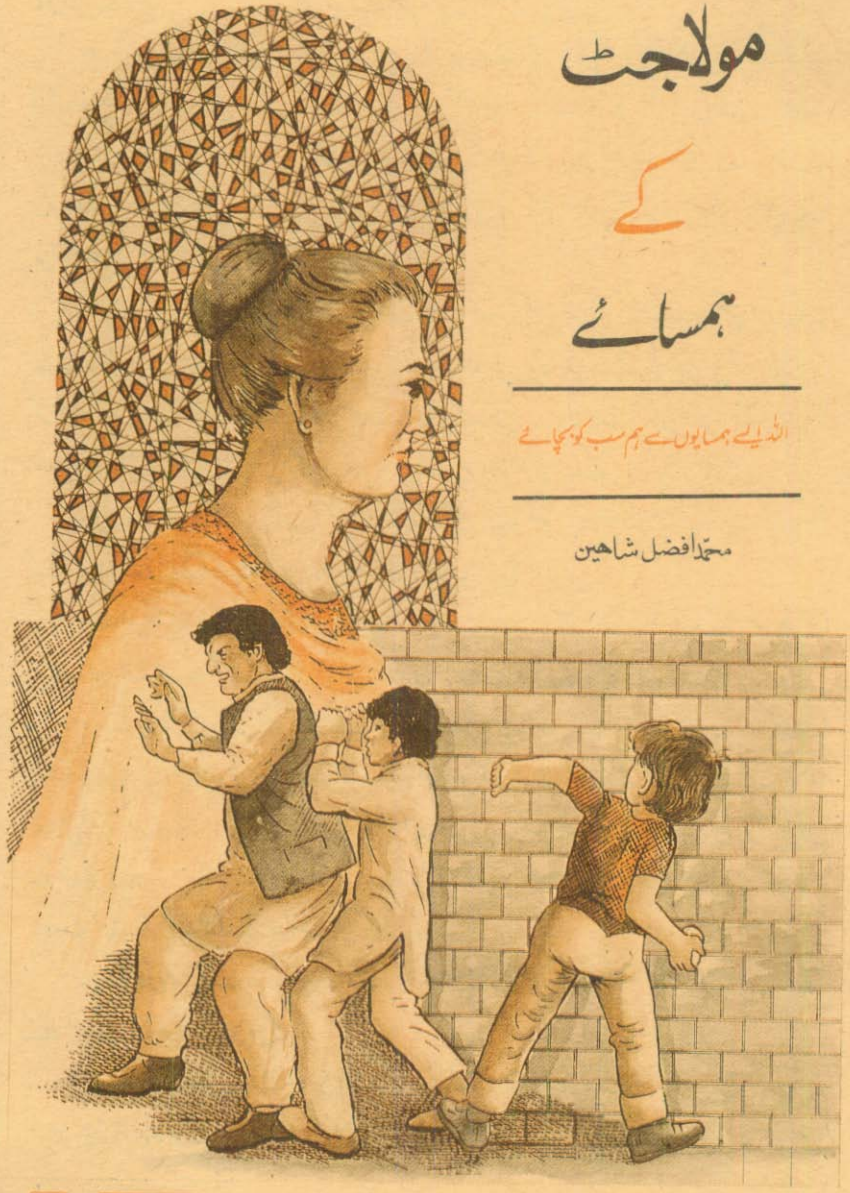

مثل مشہور ہے کہ ہمسائے ماں جائے ہوتے ہیں، لیکن ہم نے اپنے ہمسائے کے ہاتھوں اتنے دُکھ اُٹھائے ہیں کہ ع لہو لہو ہے جگر، پاش پاش روح میری

ہم پر اُن کی زیادتیوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ہمارے قلم کی سیاہی اُنہیں مکمل طور پر بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ بہرحال اس سے پہلے کہ ہم ان کی کچھ تفصیل آپ کے سامنے پیش کریں ضروری ہے کہ ان کا تھوڑا بہت تعارف ہو جائے۔ محلّے میں کوئی بھی یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے ہمسائے کتنے افراد پر مشتمل ہیں۔ اس سلسلے میں کئی روایات سننے میں آتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کرکٹ کی ٹیم بن سکتی ہے۔ اور کسی کا خیال ہے کہ باسکٹ بال کی ٹیم تیار ہو سکتی ہے۔

لیکن ہمارے ناقص خیال میں ایک ہی وقت میں یہ دونوں ٹیمیں آسانی سے تیار کی جا سکتی ہیں۔ ریاضی کے فارمولوں کی طرح ہمیں اپنے ہمسائے کے نورِچشموں کے نام بھی یاد نہیں رہتے، لیکن پنجابی فلمیں دیکھ دیکھ کر ان نورِچشموں نے خود اپنے نام کچھ اس قسم کے رکھ چھوڑے ہیں۔ مولا جٹ، نُوری نت، جگّا گُجر اور شیدا پستول وغیرہ۔ یہ نام غالباً اُن لوگوں نے اپنی دہشت میں اضافہ کرنے کے لیے اپنا رکھے ہیں۔

ویسے ان سب کو ایک ہی نام سے پُکارا جائے تو اُنھیں بے تکلّفی سے "دہشت پسند گوریلے" کہا جا سکتا ہے۔ "یہ دہشت پسند گوریلے" امن پسند محلّے والوں کے پیدائشی دُشمن ہیں۔

جب ہم پہلی بار یہاں آئے تو ہمیں جناب "نُوری نت" صاحب اگلے ہی روز گلی میں ٹکرا گئے۔ ہمیں سر سے پیر تک گھورتے ہوئے غرّائے " نواں آیا ایں سوہنیا " (نئے نئے آئے ہو بچُّو!)

" برائے مہربانی قومی زبان میں گفتگو کیجیے اور یہ آپ کا لہجہ ایسا کیوں ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؛ ہم نے اُن کی خیریت پوچھی۔ نُوری نت نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ صرف گھورتے ہوئے چلے گئے۔ ہماری ہمسائی جنہیں ہم مجبوراً خالہ کہتے ہیں۔ بڑی جنگجُو قسم کی خاتون ہیں۔ ایک دفعہ اُن کا کسی سے جھگڑا ہو گیا تو انہوں نے اپنے لختِ جگر "مولا جٹ" کو آواز دی۔ "وے مولیا" تو جناب مولا صاحب ہاتھ میں چمٹا لیے اُسے زور زور سے گھماتے ہوئے آئے اور آتے ہی کہنے لگے۔

" اوئے توُں میری بے بے نوں ماریا اے میں تینوں زندہ نئیں چھڈاں گا" (اوئے تو میری ماں کو مارتا ہے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔)

" نئیں پُتر توں ایہنوں صرف سَر وچ چمٹا مار نئیں تے اے تینوں مار دے گا" (نہیں بیٹے تو اُسے صرف سر میں چمٹا مار ورنہ یہ تجھے مار دے گا) اُن کی ماں نے ڈرتے ڈرتے کہا لیکن یہ صرف اُنہوں نے دھمکی دی

تھی۔ مولا جٹ بولا "موے نوں مولا نہ مارے تے مولا نیئوں مردا بے بے"۔ (جب تک مولا (خدا) موے کو نہیں مارتا مولا نہیں مر سکتا ماں)۔ مولا صاحب نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ صاحب سر پہ پاؤں رکھ کر ایسا بھاگے کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

ہم نے جو یہ دہشت پسندانہ سرگرمیاں دیکھیں تو ہم اُن کی دھمکی سے بھی ڈرنے لگے۔ ہم ہوئے جو سنگل پسلی۔ دوسری طرف مولا جٹ، نوری نت اور شیدا پستول وغیرہ کی والدہ صاحبہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ اُن کا مولا جٹ کسی لڑکے کا سر پھاڑ دے۔ نوری نت کسی کی کھڑکی کا شیشہ توڑ دے۔ جگا گجر کسی راہ گیر پہ پانی پھینک دے یا شیدا پستول کسی چھابڑی والے کے امرود چرا کر بھاگ جائے۔ خالہ اپنے کسی جگر گوشے کی شان میں ذرہ بھر بھی گستاخی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ عام طور پر وہ لوگوں کی شکایات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

"میرا پُتر تے بیبا ای بڑا اے" (میرا بیٹا تو بہت نیک ہے)

خالہ سے جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اتنی خونخوار فوج رکھنے کی کیا ضرورت تھی تو وہ جذباتی ہو کر کہتی ہیں۔ کہ "تم میرے بچوں کو کیا سمجھتے ہو یہ میرے بچے بڑے ہو کر کشمیر کی جنگ لڑیں گے۔ میرے یہ بچے فلسطین کو آزاد کرائیں گے"۔ اسی موقعے پر اُن کا کوئی لاڈلا کسی کا سر پھاڑ کر اور لڑ کر روتا ہوا آتا ہے تو خالہ اُن کے مستقبل پر روشنی ڈالنا بند کر کے اُسے چپ کرانے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ ہم اپنے کوٹھے کی چھت پر بیٹھے ہوئے اپنے جیتے ہوئے اخروٹ گن رہے تھے کہ خالہ کے صاحبزادے مولا جٹ تشریف لائے۔ پہلے تو کچھ دیر کھڑے شوخ نظروں سے دیکھتے رہے اور پھر اخروٹوں کی تھیلی چھین کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

"ادئے موے اخروٹ واپس کر دو۔ ورنہ بُری طرح پیش آؤں گا" ہم چلائے لیکن اُس گوریلے پر یہ شریفانہ کلام بے اثر ثابت ہوا۔ چنانچہ ہم اُس کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس ظالم نے ہمیں بڑے چکمے دیے لیکن ہم نے بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ بڑی مشکل سے آخر شاہین زیرِ دام آیا۔

"سیدھی طرح اخروٹ واپس کر دو، ورنہ پیٹ کے رکھ دوں گا"۔ ہم نے گرجتے ہوئے کہا۔

"موے دے قہر نوں آواز نہ دے اُوئے" (موے کے قہر کو آواز نہ دے ادئے) اس نے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"قہر کے بچے میرے اخروٹ واپس کر دو"۔ ہم نے اُس کے سر پر ایک چپت لگاتے ہوئے کہا۔ چپت

کا لگتا تھا کہ اُس نے اپنے گلے سے باریک آواز نکالی۔

"بے بے"... اُس کے ساتھ ہی خالہ محمد بن قاسم کی طرح اپنے لختِ جگر کی مدد کو پہنچ گئیں۔ آتے ہی انہوں نے تین مرتبہ اپنے مولے کو سینے سے لگایا جسے آئندہ کشمیر کی جنگ لڑنی تھی اور فلسطین کو بھی آزاد کرانا تھا۔ اور پھر ہمیں شعلہ برساتی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا کیا تھا میرے لال نے جو اِسے مارا ہے"؟

"یہ مم... میرے اخروٹ لے کر بھاگا تھا"۔ ہم نے خالہ سے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"خبردار جو آئندہ میرے لال کو کچھ کہا۔ اے تے بیبا اِی بڑا اے"۔ (یہ تو بہت ہی بھولا بھالا ہے) خالہ نے چاؤ سے مولا جٹ کا ماتھا چُوما اور اُسے لے کر چل دیں۔ اُن کے صاحبزادے نے مُسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور کہا "جٹ دی سٹ بڑی بُری ہُندی اے"۔ (جاٹ کی چوٹ بڑی بُری ہوتی ہے)۔

انہی حادثات سے دِل برداشتہ ہو کر ہم بعض اوقات سوچنے لگتے ہیں کہ ؎

بے در و دیوار سا اِک گھر بنانا چاہیئے　　کوئی ہمسایہ نہ ہو اُس کے کوئی بچّے نہ ہوں

یہ معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

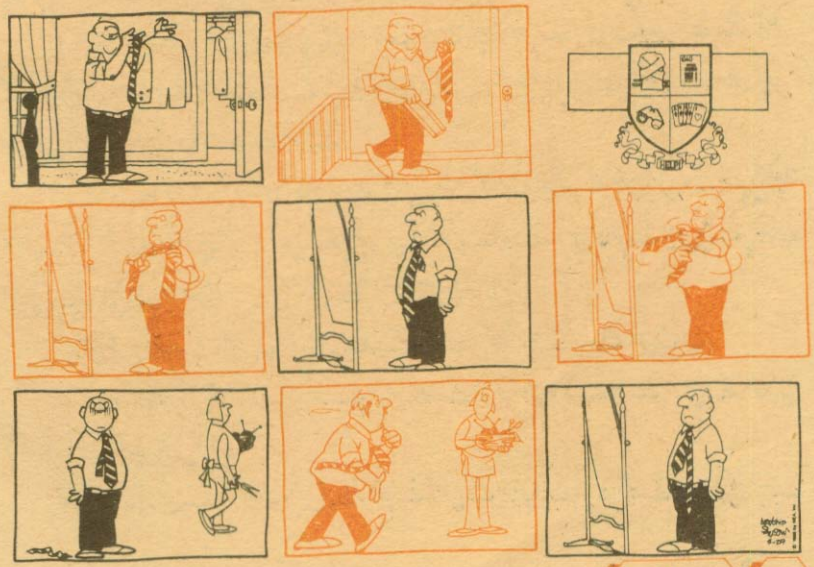

کرسٹائن کا خواب

سیّد عرفان علی یوسف

دندان ساز کی کرسی پر بیٹھ کر کرسٹائن نے اپنا سر پشت گاہ سے ٹکا دیا۔ وہ دانت نکلوانے سے خوفزدہ تھی اور اپنا ذہن بھٹکانے کے لیے کچھ اور سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے دانتوں کو رگڑنے کا آلہ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے بولا "ڈرنے کی کوئی بات نہیں، بے بی۔ تمھاری عمر کے وہ بچے جن کے سب دانت نکل آئے ہوں اور دودھ کے دانت نکلنے لگے ہوں تو بعض اوقات ان کے دودھ کے دانت ٹوٹنے سے پہلے ہی نئے دانت نکلنے لگتے ہیں۔ ایسے میں دودھ کے دانتوں کو پہلے سے نکالنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ نئے دانت ٹیڑھے لگتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا بے بی؟"

"میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھی" کرسٹائن نے کہا۔

"بھئی تمھارے دانتوں میں تکلیف اس لیے ہو رہی ہے کہ دودھ کے دانت ٹوٹنے سے پہلے ہی نئے دانت باہر نکلنے کے لیے زور لگا رہے ہیں۔ چنانچہ دودھ کے دانتوں کو پہلے ہی سے نکال دینا ضروری ہے تاکہ باہر آنے کے لیے نئے دانتوں کو جگہ مل جائے۔ اب تو آپ میری بات سمجھ گئیں نا؟"

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب" کرسٹائن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اب تم یہ بتاؤ کہ تم پرسوں صبح آسکتی ہو" ڈاکٹر نے کہا "میں تم کو ایسی دوا دیتا ہوں جس سے درد کم ہو جائے گا۔ لیکن پرسوں صبح تمھیں ناشتا کیے بغیر آنا پڑے گا۔ کیا تمھاری امّی انتظار گاہ میں موجود ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں اسکول سے سیدھی آئی ہوں" کرسٹائن نے کہا۔

"اچھا، تو تم پرسوں صبح آجاؤ لیکن اپنی امّی کو ضرور ساتھ لانا" ڈاکٹر بولا۔ کرسٹائن کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور انتظار گاہ کی طرف بڑھی جہاں ایک نرس بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے زور سے پکار کر کہا "نرس، بے بی کو پرسوں صبح کا وقت دے دو"

نرس نے جھک کر رجسٹر میں کچھ دیکھا پھر بولی "آپ نو بج کر ۱۵ منٹ پر آجائیے"

"جی۔ اچھا" کرسٹائن آہستہ سے بولی۔

"اتنی غمگین مت ہوئیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی" ڈاکٹر بولا۔

کرسٹائن کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ڈاکٹر اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ کرسٹائن دروازے کی طرف بڑھی تو نرس نے اُٹھ کر خود دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر ہمدردانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

کرسٹائن کا دل اور زیادہ زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ فٹپاتھ پر ریڑھی اور ٹھیلے والوں کی وجہ سے چلنے کی جگہ بہت کم تھی۔ وہ جب روزانہ اسکول سے واپس گھر لوٹتی تھی۔ تو اس کا کام ٹھیلے پر بکنے والی چیزیں، کھلونے، کتابیں اور کپڑے وغیرہ دیکھتے ہوئے چلنا ہوتا تھا۔ لیکن آج اُسے کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ذرا دیر میں وہ بس اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ گھر جانے والی بس موجود تھی اور کنڈیکٹر مسافروں کو بلانے کے لیے آواز لگا رہا تھا۔ وہ بس کے زنانہ حصّے میں ایک خالی نشست پر بیٹھ گئی اور بے چینی سے بس کے چلنے کا انتظار کرنے لگی۔

جب وہ گھر پہنچی تو اُس کی امّی کپڑوں پر استری کر رہی تھیں۔ اُس نے امّی کو سلام کیا۔ امّی نے جواب

دیتے ہوئے کہا: "کرسٹائن۔ تمہارے دانت کا درد اب کیسا ہے؟"

"اب کچھ کم ہے۔ ڈاکٹر نے دوا لگا دی تھی۔" اُس نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟" اُس کی امّی نے پوچھا۔

"ڈاکٹر کہتا ہے امّی جان کہ یہ دانت نکلوانا پڑے گا۔ دانت میں درد اس لیے ہو رہا ہے کہ نیچے سے نکلنے والے دوسرے دانت باہر آنے کے لیے زور لگا رہے ہیں اگر اس دانت کو نکالا نہ گیا تو دوسرے دانت ٹیڑھے نکلیں گے اور تکلیف بھی زیادہ ہوگی۔" اس نے بتایا۔

"اوہ" اس کی امّی نے کہا "تو اس میں اتنا افسوس کرنے کی کیا بات ہے۔ میں جب تمہاری عمر کی تھی تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہُوا تھا۔"

"لیکن امّی۔" کرسٹائن نے اپنا جُھکا ادھورا چھوڑ دیا۔

"تمھیں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔" اس کی امّی بولیں۔

"ڈاکٹر مسوڑھے کو سُن کر کے دانت نکال لے گا۔"

کرسٹائن نے سر ہلا دیا۔

"اس نے تمھیں کب بلایا ہے؟" اس کی امّی نے پوچھا۔

"پرسوں، نو بج کر پندرہ منٹ پر۔" وہ بولی۔

"تم فکر مت کرو۔" اس کی امّی نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ چلی چلوں گی۔"

بقیہ دو دن جلد ہی گزر گئے۔ ان دو دنوں تک کرسٹائن اپنا دانت نکلوانے کے بارے میں اتنا سوچتی رہی کہ خود کو بیمار محسوس کرنے لگی۔ وہ جتنا اس خوف سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی اتنا ہی زیادہ اُسے خوف آتا۔ اسکول میں اُس کی سہیلیوں نے بھی اُسے خاصی تسلّی دی اور کہا کہ دانت نکلوانے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، لیکن اس کا خوف اپنی جگہ قائم رہا۔ وہ اپنی زبان مضبوطی سے جمے ہوئے دانت پر پھیرتی۔ تو اُسے اپنے دانت سے محبّت سی ہونے لگتی۔ وہ دل ہی دل میں اللہ میاں سے کہتی کہ اللہ میاں کیا ضروری تھا کہ بچوں کے دودھ کے دانت ٹوٹتے اور نئے نئے دانت نکلتے۔ پُرانے دانتوں سے بھی تو کام چل سکتا تھا۔ اس کے دودھ کے دانت بے حد خوبصورت اور چمکدار تھے لیکن ڈاکٹر کہتا تھا۔ کہ اگر اُس نے یہ دانت نہیں نکلوائے تو نئے دانت بدصورت اور بدنما نکلیں گے۔

تیسرے دن وہ علی الصبح جاگ گئی۔ اور پھر دوبارہ نہ سو سکی۔ جب دن کی روشنی پھیل گئی تو بھی

اپنے بستر میں لیٹی رہی۔ اسے آج ناشتا تو کرنا نہیں تھا کیونکہ ڈاکٹر نے ناشتا کرنے پر پابندی لگا دی تھی جب اس کے ڈیڈی دفتر چلے گئے تو وہ اُٹھی۔ لباس تبدیل کیا' دانت صاف کیے اور منہ دھویا۔ دانتوں پر برش پھیرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کل کا دن آج سے مختلف ہوگا اور اس کا ایک دانت کم ہو چکا ہوگا۔۔۔

تھوڑی دیر بعد اُس کی امّی اُس کے کمرے میں آئیں اور اُسے جاگے ہوئے دیکھ کر بولیں" او ہو۔ تو تم جاگ چکی ہو۔ اچھا جوتے پہن کر تیار ہو جاؤ"۔

وہ اپنی طبیعت پر جبر کرتے ہوئے مُسکرائی۔ اس کی امّی باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر میں کار کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ اس کی امّی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں کار شہر کے پُرانے علاقے سے گزر رہی تھی۔ انھیں صدر جانا تھا۔ صدر بھی شہر کا پُرانا علاقہ تھا۔ اگرچہ بہت سی پُرانی عمارتوں کی جگہ نئی عمارتیں بن چکی تھیں لیکن بہت سی پُرانی عمارتیں ابھی تک باقی تھیں۔ صدر کا گھنٹہ گھر اور ایمپریس مارکیٹ بھی کم از کم ڈیڑھ سو سال پُرانی تھی۔ صدر میں سڑکوں پر ٹریفک کا اژدہام ہوتا تھا۔ اس کی امّی بے حد احتیاط سے کار چلا رہی تھیں" آج سے سو سال پہلے کوئی تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں اس قدر بھیڑ ہوگی" انھوں نے کہا

" جی۔ امّی" وہ ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے بولی" سو سال پہلے شہر کتنا بڑا رہا ہوگا؟"

" تمھارا کیا خیال ہے کتنا بڑا ہوگا؟" اس کی امّی نے پوچھا۔

" میرا خیال ہے کہ صدر تو ہمیشہ ہی سے شہر کا مرکز ہے" وہ بولی۔

" نہیں ایسا نہیں ہے" اس کی امّی نے کہا۔

" آج سے پچاس سال پہلے صدر پر شہر کی حدود ختم ہو جاتی تھی۔ یہاں سے مشرق کی طرف ویرانہ اور جنگل تھا۔۔۔"

وہ حیران ہوتی رہی۔ اب شہر اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ صدر سے ہر جانب چالیس چالیس میل تک آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر میں ہی ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچ گئے تھے۔ اس کی امّی نے کہا" ابھی سوا نو بجنے میں پورے بیس منٹ باقی ہیں تم انتظار گاہ میں بیٹھو۔ جب تک میں کچھ شاپنگ کر لوں"

اُس کی امّی باہر نکل گئیں اور وہ انتظار گاہ میں کھڑکی کے سامنے بیٹھ گئی۔ کلینک کے سامنے والی عمارت کافی قدیم تھی۔ پتھر کی بنی ہوئی اس عمارت پر ۱۹۰۲ء تحریر تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ ۸۰ سال پہلے

اس سڑک پر چلنے والے لوگ کیسا لباس پہنتے ہوں گے ۔ اچانک ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر نکلا ۔ اُسے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا "تم بیس منٹ پہلے آگئی ہو ۔ لیکن خیر ۔ اس وقت کوئی مریض نہیں ہے اس لیے اندر آجاؤ" وہ مُردہ قدموں سے اُٹھی اور ڈاکٹر کے کمرے میں کرسی پر جا کر بیٹھ گئی ۔ ڈاکٹر اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مردنی دیکھ کر ہنسا اور بولا "بے بی ۔ تم نے تو ایسی شکل بنائی ہوئی ہے کہ جیسے میں تمھیں قتل کرنے جا رہا ہوں"

وہ ہنس دی ۔ پھر بولی "میں بالکل ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں"

"تمھاری امّی تو تمھارے ساتھ آئی ہیں نا؟" اُس نے پوچھا ۔

"جی ہاں، وہ شاپنگ کرنے گئی ہیں" وہ بولی ۔

کمرے میں ایک اور آدمی موجود تھا جو سفید لیب کوٹ پہنے ہوئے تھا ۔ اس نے پلاسٹک کا ایک بیگ اس کے گلے میں باندھ دیا اور نرم ربر کا ایک ٹکڑا اس کے دانتوں کے درمیان رکھ دیا ۔ پھر مزاحیہ لہجے میں بولا "آپ اس پر کاٹ سکتی ہیں"

ڈاکٹر نے ایک غلاف اپنے چہرے پر چڑھا لیا اور بولا "اب آپ گہرے گہرے آٹھ دس سانس لیجیے" کرسٹائن نے میٹھی میٹھی سی خوشبو محسوس کی ۔ بے ہوش کرنے والی دوا تیزی سے اس کے اعصاب پر اثر کر رہی تھی ۔ کرسٹائن کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی گہرے کنویں میں گر رہی ہے ۔ تاریکی چاروں طرف پھیل رہی ہے ۔

وہ ایک تنگ گلی میں چل رہی تھی ۔ اس کے بائیں ہاتھ پر پُرانی طرز کے مکانات تھے اور دائیں ہاتھ پر کھیت تھے ۔ اس کے پیچھے سے قدموں کی چاپ سُنائی دی ۔ اس کی ہم عمر ایک لڑکی اس کے قریب آگئی "ہے" لڑکی نے اُس کے قریب آکر کہا "میرا نام سلمٰی ہے ۔ آپ یہاں اجنبی معلوم ہوتی ہیں"

کرسٹائن نے اُسے غور سے دیکھا اور بولی "مجھے معلوم نہیں" یہ جگہ اُسے جانی پہچانی معلوم ہو رہی تھی ۔ پُرانے فیشن کی عمارتیں صبح کے دھندلکے میں سوئی سوئی سی لگ رہی تھیں ۔ سڑک کے ساتھ ساتھ لمبی لمبی گھاس لگی ہوئی تھی ۔ جس گلی میں وہ چل رہی تھی وہ آگے چل کر چوڑی گلی میں تبدیل ہو گئی ۔ ذرا دیر میں وہ ایک بڑے چوک کے سامنے پہنچ گئی ۔ چوک کے ساتھ ہی ایمپریس مارکیٹ تھی ۔ مارکیٹ کے ساتھ لائن سے بہت ساری وکٹوریہ گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں ۔ سڑک کے درمیان میں ایک ٹرام کار چل رہی تھی ۔ لڑکی جس نے اپنا نام سلمٰی بتایا تھا اب بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی ۔ وہ ایک پھول دار

لمبی قمیض پہنے ہوئے تھی جس پر سندھی طرز کے پھول، بیل اور بوٹے بنے ہوئے تھے۔ قمیض کا رنگ گہرا گلابی اور عنابی تھا۔ اس نے اپنے بال ایک چھوٹی سی اوڑھنی میں چھپائے ہوئے تھے۔ لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کے منہ میں دانتوں کی ایک قطار کے بجائے دو قطاریں تھیں اور اس کے دانت آگے پیچھے اور ٹیڑھے میڑھے تھے اور بے حد بدنما لگ رہے تھے۔ اس کا دانت بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک خوبصورت رومال تھا جس پر پھول کڑھے ہوئے تھے۔ کرسٹائن کو اپنی طرف غور سے دیکھتے پا کر اس نے جلدی سے ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا اور جھینپ کر بولی: "میرا ایک دانت گائے نے ٹکر مار کر توڑ دیا تھا۔ میں گائے کا دودھ دوہ رہی تھی۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔" کرسٹائن نے سوچا۔

"میرا چچا مجھے شہر لایا ہے۔" سلمیٰ بولی "تاکہ" جراح میرا ٹوٹا ہوا دانت نکال دے۔"

"جراح" کرسٹائن نے کہا۔ اُسے یاد آیا اُس نے اپنی کتاب میں پڑھا تھا کہ پُرانے زمانے میں جرّاح دانت بھی نکالتے تھے اور مرہم پٹی بھی کرتے تھے اور بال بھی کاٹ دیتے تھے۔ لیکن آج کل تو دانت نکالنے کا کام ڈاکٹر کرتے ہیں اس نے سوچا۔

"میں بہت ڈرتی ہوں۔" سلمیٰ نے کہا "اس لیے میں نے جرّاح سے دانت نکلوانے سے انکار کر دیا۔ جرّاح اتنی بے دردی سے دانت نکالتے ہیں کہ بچے تو بچے، بڑے بھی درد سے چلّانے لگتے ہیں۔ میں نے اپنے سے بڑے لوگوں کو دانت نکلواتے وقت زور زور سے چلّاتے اور روتے ہوئے دیکھا۔ میرا چچا میرا ہاتھ پکڑ کر جرّاح کے سامنے لے گیا۔ جرّاح کے ہاتھ اور کپڑے بے حد گندے تھے اور ان پر خون جما ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ کر اتنی ڈری کہ اُس کی کُرسی پر سے کُود کر بھاگ گئی۔ جرّاح، اس کا لڑکا اور چچا میرے پیچھے بھاگے۔ میں اُنھیں اپنے پیچھے بھاگتے دیکھ کر اور تیز بھاگی۔ میں جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔" سلمیٰ مسلسل بولتی رہی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ایمپریس مارکیٹ کے سامنے جرّاحوں کی دکانوں کے قریب پہنچ گئے۔

اچانک سلمیٰ خوف زدہ نظر آنے لگی۔ "میں آپ کے ساتھ اس سے آگے نہیں جا سکتی۔" اُس نے رُکتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" کرسٹائن حیران ہو کر بولی۔

"میں وہاں رہتی ہوں جہاں آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں گھوڑوں نے مجھے کُچل دیا تھا۔" سلمیٰ نے کہا۔

کرسٹائن کو خوف کی ایک لہر سی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی محسوس ہوئی "تمھارا کیا مطلب ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں جب بھاگ رہی تھی اُس وقت کہیں سے شہد کی بہت سی مکھیاں آگئیں۔ اور انھوں نے آدمیوں اور جانوروں کو کاٹنا شروع کر دیا۔ جب میں گھوڑوں کے پاس سے گزر رہی تھی تو مکھیوں کے کاٹنے سے گھوڑے بدک گئے۔ اور انھوں نے مجھے اپنے سُموں سے کُچل کچل کر مار ڈالا۔ جبھی تو اس گلی کا نام سلمٰی گلی ہے۔"

"کیا بے کار بات کر رہی ہو تم" کرسٹائن نے کہا۔

"تم زندہ ہو اور ٹھیک ٹھاک ہو" اُس نے اس کے خوبصورت اور صحت مند ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔

سلمٰی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور ہاتھ چھُڑا کر بھاگنے لگی۔ کرسٹائن نے بھاگ کر اُسے پکڑنے کی کوشش کی۔ سلمٰی کا رومال اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اور وہ تیزی سے آگے نکل گئی۔

"سلمٰی، ٹھہرو۔ سلمٰی ٹھہرو"۔ کرسٹائن نے اُسے زور زور سے آوازیں دیں۔

"سب ٹھیک ہے بے بی"۔ کرسٹائن کو ایک آواز سنائی دی "انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"

"سلمٰی ٹھہرو" کرسٹائن نے پھر کہا۔

"او ہو۔ بے بی۔ اب آپ جاگ جائیے" یہ ڈاکٹر کی آواز تھی "آپ کا دانت نکالا جا چکا ہے" اس کے سر پہ بہت تیز روشنی کا بلب روشن تھا۔ کرسٹائن کو اپنی پلکیں بے حد بھاری محسوس ہوئیں۔ اُسے آنکھیں کھولنے کے لیے بہت مشقت کرنا پڑی۔

"یہ لیجئے" ڈاکٹر نے گلابی رنگ کے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اس سے آپ کُلی کر لیجئے لیکن زیادہ نہیں"

کرسٹائن نے گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پانی سے کُلی کرنے لگی۔ اس کے دانت سے اب بھی خون نکل رہا تھا۔

"سب ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے کہا "آپ انتظار گاہ میں تشریف رکھیے۔ اتنی دیر میں آپ کی امّی بھی آجائیں گی"

اس کی امّی انتظار گاہ میں موجود تھیں۔ اُسے دیکھ کر وہ مسکرائیں اور بولیں "تم ٹھیک ہو نا"

کرسٹائن ؟"

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے سر ہلا دیا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک سلمٰی کا عکس گھوم رہا تھا۔ کیا یہ سب خواب تھا؟ کیا اُس نے سلمٰی کو خواب میں دیکھا تھا؟ بے چاری سلمٰی! وہ مسلسل سلمٰی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"میں کار لینے جا رہی ہوں" اُس کی امّی نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ وہیں بیٹھی سلمٰی سے ہونے والی گفتگو دہراتی رہی۔ پھر وہ پُرانے دانت نکالنے والے جرّاحوں کا اپنے ڈاکٹر سے موازنہ کرنے لگی۔ ڈاکٹر نے کس قدر آرام سے اس کا دانت نکال دیا تھا۔ اور اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ بے چاری سلمٰی اپنا دانت نکلوانے سے ڈر کر بھاگی تھی جبھی تو اُسے گھوڑوں نے کُچل کر مار دیا تھا۔

باہر سے کار کا ہارن سُنائی دیا۔ نرس اُٹھ کر کھڑکی تک گئی اور باہر دیکھ کر کرسٹائن سے بولی "تمھاری امّی آگئی ہیں۔ کیا میں تمھیں سہارا دے کر کار تک پہنچا دوں؟"

"جی نہیں شکریہ!" کرسٹائن نے کہا "میں خود جا سکتی ہوں"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر اُسے اچانک اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہُوا اور اُس نے گرنے سے بچنے کے لیے فٹ پاتھ پر بنی ہوئی لوہے کی ریلنگ کا سہارا لیا۔ اچانک اس کی نظر دیوار پر پڑی۔ دیوار پر لگے ہوئے پتھر پر اس گلی کا نام کھُدا ہُوا تھا۔ "سلمٰی لین"۔ ایک لمحے کے لیے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ "سلمٰی لین" اس نے پھر دُہرایا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے کوٹ کی جیب میں چلا گیا۔ کوئی نرم چیز اس کی انگلیوں سے ٹکرائی۔ _____ یہ گلابی رنگ کا کڑھا ہُوا وہی رومال تھا جو بھاگتے ہوئے سلمٰی کے ہاتھ سے چھُوٹ کر اُس کے ہاتھ میں آگیا تھا۔

کرسٹائن کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا اور اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اس کی امّی کار سے باہر نکلیں اور اُسے سہارا دے کر کار تک لائیں۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے اُس نے پتھر کی تختی کی طرف اشارہ کیا اور بولی "امّی جان اس گلی کا نام سلمٰی لین ہے۔ غالباً یہ بہت پُرانا نام ہے"

"پتہ نہیں یہ سلمٰی کون تھی؟" اس کی امّی نے کہا۔

"سلمٰی ایک لڑکی تھی جسے گھوڑوں نے کچل کر ہلاک کر دیا تھا۔ وہ اپنا دانت نکلوانے سے ڈرتی تھی۔ اس گلی کا نام اسی کی یادگار کے لیے سلمٰی لین رکھا گیا تھا" کرسٹائن نے کہا۔

"ہونہہ۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا" اس کی امّی بے یقینی سے بولیں۔

"اور یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

کرسٹائن نے ہاتھ کھول دیا۔ سلمٰی کا کڑھا ہوا رومال اس کے ہاتھ میں تھا۔ "یہ تم کس کا رومال اُٹھا لائیں؟" اس کی امّی نے کہا۔

"یہ سلمٰی کا رومال ہے۔" وہ بولی۔

"ہُش" اس کی امّی نے کہا۔ "تم اپنے ہوش میں معلوم نہیں ہوتیں۔ کل تم یہ رومال نرس کو واپس کر دینا۔ کسی سے وہاں گر گیا ہوگا۔"

کرسٹائن خاموش رہی۔ وہ کسی ایسی بات پر اصرار نہیں کر سکتی تھی جو وہ اپنی ماں کو نہ سمجھا سکتی۔ وہ سلمٰی کا رومال تھا۔ اسے اس کا پورا یقین تھا۔ لیکن سلمٰی اب اپنا رومال لینے نہیں آ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ مر چکی تھی۔ "اب میں دانت نکلوانے سے خوفزدہ نہیں ہوں۔" وہ بولی۔

"کرسٹائن" اس کی امّی نے کہا۔ "تم اس آدھ گھنٹہ میں بالکل بدل گئی ہو۔"

کرسٹائن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سلمٰی کا ہنستا مسکراتا چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔ کرسٹائن نے جب اس کا ہاتھ پکڑا تھا تو اس کے نرم ہاتھ کا لمس اور گداز اسے ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔ "ڈیئر سلمٰی!"

کرسٹائن نے دل میں کہا۔ "میں تمھارا یہ تحفہ ہمیشہ سنبھال کر رکھوں گی اور دانت نکلوانے سے ہرگز نہیں ڈروں گی۔"

ٹارزن اولمپک کھیلوں میں

امریکی پیراک جانی وَیز مُلّر نے ۱۹۲۴ء کے پیرس اولمپک میں پیراکی کے مقابلوں میں سونے کے تین تمغے جیت کر بڑی شہرت حاصل کی۔ اُن کا جسم بہت مضبوط اور خوبصورت تھا۔ امریکہ کا مقام ہالی وُڈ دنیا بھر میں فلمی صنعت کا سب بڑا مرکز ہے۔ ہالی وُڈ والوں تک جب اُن کی شہرت پہنچی تو انھوں نے جانی وِیز مُلّر سے ٹارزن کی فلموں میں کام کرنے کی درخواست کی۔ اس طرح وہ ٹارزن بن گئے۔ یہاں یہ بات بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ بچپن میں بہت کمزور تھے اور انھیں دل کا مرض بھی تھا۔ اسی لیے ڈاکٹروں نے اُنھیں پیراکی سیکھنے کا مشورہ دیا تھا اور یوں وہ نہ صرف پیراکی بلکہ فلمی دنیا کے بھی ٹارزن بن گئے۔

مرسلہ: حبیب الرحمٰن ضیاء۔ کراچی

دُودھ کی بدولت

ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال

روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت

کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"

ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔

اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔

دائی کی بات سنو

دُودھ پیو — مضبوط بنو

اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

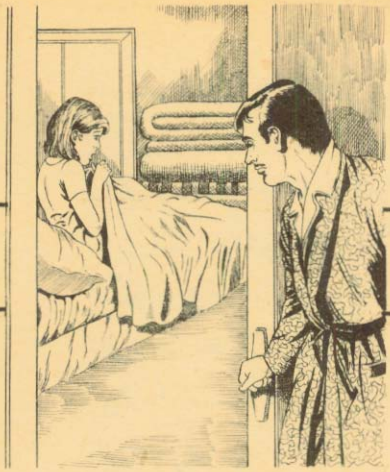

اعتبار

اُن گھروں کا قصہ جہاں ہر وقت بچّوں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے

عمران مشتاق

سخت پیاس سے اُس کا حلق سُوکھ رہا تھا۔ پانی کی طلب نے ہی اُسے گہری نیند سے بیدار کیا تھا۔ وہ غنودگی کے عالم میں چلتی ہوئی فریج کے پاس آئی "ارے یہ کیا؟" ساری غنودگی سیکنڈوں میں دُور ہوگئی۔ سامنے فرش پہ شیشے کا ڈونگا ٹوٹا پڑا تھا۔ ساری کھیر دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اُس وقت آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ وہ زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکی۔ اپنے کمرے میں آکر وہ پریشانی سے ٹہلنے لگی "امّی کبھی یقین نہیں کریں گی کہ ڈونگا میں نے نہیں توڑا۔ وہ یقین کر بھی کیسے سکتی ہیں ہمیشہ برتن مجھ سے ہی تو ٹوٹتے ہیں۔ اور بھی تو ہیں گھر میں، لیکن برتن تو میرے ہی ہاتھوں سے گرتے ہیں۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔ امّی کو کیسے یقین دلاؤں" اس کا ننھا سا دل خوف سے لرزنے لگا۔ امّی کی پرسوں کی مار اُسے ابھی تک یاد تھی۔ پرسوں اُس سے امّی کے نئے ڈنر سیٹ کی دو پلیٹیں ٹوٹ گئی تھیں۔ امّی نے اُس کے پھُول جیسے گالوں پر بڑی بے دردی سے تھپّڑ لگائے تھے۔ تھپّڑوں کی جلن وہ ابھی تک گالوں پہ محسوس کر رہی تھی "اللہ میاں جی اب کیا ہوگا۔ میرے اچھّے اللہ میاں مجھے کہیں چھُپا لیں جہاں امّی نہ ڈھونڈ سکیں" اُسے اپنی بے بسی پہ رونا آرہا تھا "مجھے کچھ کرنا چاہیے ورنہ ..." اس کا ہاتھ اپنے گال پہ پہنچ کر رُک گیا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی اور دوسرے کمروں میں جھانکنے لگی۔ امّی سو رہی تھیں۔ ابّو ابھی آفس سے نہیں آئے تھے، باجی اور ٹیپو بھی سو رہے تھے۔ بھائی جان پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اُسے کمرے میں جھانکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دادا جان کے

کھانسنے کی آواز ڈی لاؤنج تک آرہی تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ جاگ رہے ہیں۔ وہ باہر برآمدے میں آگئی۔ چاروں طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی پھر کار پورچ کے لیے بنائے گئے شیڈ کے نیچے ایک طرف پڑی کرسی پہ بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی۔

"یہ کھیر کا ڈونگا کس نے توڑا ہے؟" امّی کی تیز آواز سُن کر سب اپنے اپنے کمروں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ امّی کی تیز نظریں سب کا جائزہ لینے لگیں۔ "یہ گڑیا کہاں ہے؟" شاید ابھی تک سو رہی ہے۔" باجی بولیں۔ "جاؤ اُسے اُٹھاؤ۔ میرا خیال ہے یہ ڈونگا اُسی نے توڑا ہے۔" امّی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ باجی گڑیا کو اُٹھانے کے لیے چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد باجی واپس آئیں تو اُن کے چہرے پہ حیرانی تھی۔ "امّی وہ تو اپنے کمرے میں نہیں ہے۔" باجی نے بتایا۔ "ہوں! تو میرا خیال ٹھیک تھا۔ دیکھو وہ کہیں چھپی ہو گی۔ اُسے جلدی ڈھونڈ کر لاؤ۔ آج میں اُس کی اتنی پٹائی کروں گی کہ یاد ہی رکھے گی۔" امّی نے غصّے کے عالم میں کہا۔

"امّی آپ گڑیا کو مارا نہیں کریں۔ وہ بے حد خوفزدہ اور چپ چاپ رہنے لگی ہے۔" بھائی جان سنجیدگی سے بولے۔ "تم اُس کی حمایت نہ کیا کرو۔ جو غلطی کرے گا اُسے سزا تو ضرور ملے گی۔ اور تو کسی سے برتن نہیں ٹوٹتے۔ آخر اُسی کے ہاتھ سے کیوں ٹوٹتے ہیں۔" امّی نے بھائی جان کی بات سُن کر بُرا سا منہ بنایا۔

"امّی میں نے دیکھا ہے برتن اُٹھاتے ہوئے گڑیا کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں۔ وہ پوری احتیاط کرتی ہے۔ لیکن زیادہ احتیاط سے بھی کبھی کبھار کوئی برتن گر کے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ خوف کا شکار ہو چکی ہے۔ جو بھی کام کرنے کی کوشش کرتی ہے وہ اُس سے غلط ہو جاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اُسے اس خوف سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ جبکہ مار پیٹ سے وہ اپنا اعتماد کھو دے گی۔" بھائی جان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم اپنی نفسیات اپنے پاس ہی رکھو میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔" امّی ناخوشگوار لہجے میں بولیں...

"لیکن امّی..."

"بس... بس اپنی یہ نصیحتیں اپنے تک ہی رکھو۔" بھائی جان کا جُملہ پورا ہونے سے پہلے ہی امّی بولیں۔ اور بھائی جان بے بسی سے فرش کی جانب دیکھنے لگے۔

"گڑیا باجی کہیں بھی نہیں ہیں۔ میں نے گھر میں ہر جگہ تلاش کر لیا ہے۔" ٹیپو میاں نے اطلاع دی۔

"تم نے ٹھیک طرح سے دیکھا ہے نا!" امّی نے پوچھا۔ "ہاں۔" ٹیپو میاں سر ہلاتے ہوئے بولے تھوڑی دیر بعد باجی واپس آگئیں انہوں نے بھی گڑیا کے موجود نہ ہونے کی اطلاع دی۔ "ہوں۔" امّی کچھ سوچنے لگیں۔ "ہو سکتا ہے وہ صفیہ کے ہاں چلی گئی ہو۔ شرجیل ذرا فون کر کے پتا تو کرو۔ وہ پہلے بھی پٹائی کے ڈر سے دو تین بار ایسا کر چکی ہے۔" امّی نے بھائی جان سے کہا۔ صفیہ گڑیا کی خالہ کا نام تھا۔ وہ قریب ہی رہتی تھیں۔ بھائی جان اُن کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔ وہ کافی دیر تک ریسیور اُٹھائے کھڑے رہے پھر ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے بولے "خالہ شاید گھر پر نہیں ہیں۔ فون کی بیل تو جا رہی ہے۔ لیکن کوئی اُٹھا نہیں رہا۔"

"اچھا۔" امّی سوچ میں گم ہو گئیں پھر بولیں "شرجیل تم صفیہ کے گھر سے پتا کر کے آؤ۔ ہو سکتا ہے اُس کا فون ہی خراب ہو اور ہاں نازیہ کے ہاں سے بھی پوچھ لینا۔" امّی کی بات سُنتے ہی بھائی جان باہر چلے گئے۔

"بھئی خیریت تو ہے سب ایک جگہ جمع ہیں۔" ابّو ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بولے وہ آفس سے ابھی ابھی آئے تھے۔

"وہ ابّو گڑیا باجی کھو گئی ہیں۔" ٹیپو میاں فوراً بولے۔

"کھو گئی کیا مطلب؟" ابّو نے حیرانی سے پوچھا۔

"ٹیپو تم چپ رہو۔" امّی نے سرزنش کی۔ "وہ اصل میں کھیر کا ڈونگا توڑ کر پٹائی کے ڈر سے کہیں چھپ گئی ہے یہیں کہیں ہو گی۔" انہوں نے بتایا۔

"اچھا اس کے ملنے کے بعد آپ اُسے میرے پاس بھیج دیجیے گا۔ آپ اُسے کوئی سزا نہیں دیں گی۔ بچی پہلے ہی سہمی سہمی رہنے لگی ہے۔ میں ذرا تب تک کپڑے بدل لوں۔" ابّو جاتے جاتے بولے۔ امّی نے اُن کی بات سُن کر بُرا سا منہ بنایا۔ وہ سب بھائی جان کا انتظار کرنے لگے۔ ٹیپو میاں کے کھیلنے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ سب کو فکر مند چھوڑ کر کھیلنے کے لیے چلے گئے۔

"امّی، گڑیا نہ تو خالہ کے ہاں ہے اور نہ ہی نازیہ کے گھر۔ خالہ جان صبح سے کہیں گئی ہوئی تھیں۔ ابھی ابھی آئی ہیں۔" بھائی جان نے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بتایا۔ "ہائے اللہ پھر کہاں چلی گئی؟" امّی پریشانی سے بولیں۔

"میرے پاس گڑیا کی دو تین سہیلیوں کے ٹیلیفون نمبر ہیں۔ میں فون کر کے پتا کرتی ہوں۔" باجی نے ٹیلیفون کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ امّی کے چہرے سے پریشانی کے آثار واضح تھے۔ وہ زیرِ لب دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ بھائی جان بھی فکرمند بیٹھے تھے۔ باجی کو آتے دیکھ کر امّی اور بھائی جان دونوں پُرامید نظروں سے باجی کی طرف دیکھنے لگے۔ "نہیں وہ اپنی کسی سہیلی کے ہاں نہیں گئی۔ اللہ خیر کرے۔" باجی کی آواز لرز رہی تھی۔ "ہائے میرے اللہ مجھ پہ رحم کر دے۔ میری بچی کو مجھ سے ملا دے۔" امّی گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگیں۔ "بھئی کچھ پتا چلا۔" ابّو کپڑے بدل کر واپس آ چکے تھے۔

"ابّو ہم نے ہر جگہ تلاش کر لیا لیکن کچھ پتا نہیں چل رہا کہ وہ کہاں گئی ہے۔" بھائی جان نے فکرمندی سے کہا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ ہمیشہ کی طرح کہیں چھپ گئی ہوگی۔ مگر یہ تو تشویش کی بات ہے۔" ابّو بھی بُری طرح پریشان ہو گئے۔۔۔

"آپ لوگ یہاں بیٹھے ہیں اور ادھر میری بچی نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ جائیں اُسے کہیں تلاش کریں۔" امّی روتے ہوئے بولیں۔ ابّو اور بھائی جان دونوں باہر نکل گئے۔ باجی امّی کو چُپ کرانے کی کوششیں کرنے لگیں۔ دادا جان اپنے کمرے میں تھے۔ اُنہیں اس سارے ہنگامے کا پتا نہ تھا۔ انہیں جب پتا چلا تو وہ جانماز بچھا اللہ سے گڑیا کی خیریت کی دعائیں کرنے لگے۔ امّی روتے روتے چپ ہو گئیں۔ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان نشر ہو رہا تھا۔ "ایک دس سالہ گوری چٹّی بچّی جس نے سفید پھولدار فراک پہنا ہوا ہے، پیروں میں ہوائی چپل ہے۔ بالوں کی دو چوٹیاں بنائے ہوئے ہے، کہیں کھو گئی ہے جس کسی کو بھی اس کے بارے میں کوئی اطلاع ہو وہ مسجد کی انتظامیہ کو مطلع کرے۔" اعلان کئی بار دہرایا گیا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ باجی امّی کو تسلّیاں دے رہی تھیں لیکن امّی کو کسی پل قرار نہ تھا۔ شام کے سات بج رہے تھے جب ابّو اور بھائی جان واپس آئے۔ وہ بے حد تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ ناکامی اُن کے چہروں سے ہی عیاں تھی۔ امّی پھر رونے لگیں۔

"یا میرے پروردگار۔ میری گڑیا کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ ایک بار مجھے اُس سے ملا دے۔ میں آئندہ اُسے کبھی نہیں ماروں گی۔ اُسے کبھی کچھ نہ کہوں گی۔ صرف ایک بار میرے مالک۔" امّی روتے روتے دعائیں بھی مانگتی جا رہی تھیں۔۔۔

"امّی آپ کو ایک بات بتانی تھی۔" ٹیپو میاں امّی کے پاس جا کر بولے۔ "وہ امّی۔۔۔ وہ ڈونگا مجھ سے ٹوٹا تھا۔" ٹیپو میاں ڈرتے ڈرتے بولے۔

"تو وہ تم تھے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" امّی کی آنکھیں گویا شعلے اگلنے لگیں۔ ٹیپو میاں دوڑ کر ابّو کے

پیچھے چھپ گئے۔ "بس بیگم! یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ گڑیا کی خیریت کی دعائیں مانگو۔" ابو ٹیپو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ امّی نے ایک نظر ٹیپو پہ ڈالی اور پھر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگیں۔ "گڑیا بیٹی مل گئی نا" داداجان پوچھ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر ابھی ابھی آئے تھے۔ "نہیں داداجان ابھی تو نہیں، لیکن جلد ہی مل جائے گی" بھائی جان پُرامید لہجے میں بولے۔ "اللہ مالک ہے وہ ضرور ہماری بیٹی کو ہم سے ملائے گا۔" داداجان ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ "داداجان آپ کو شاید سردی لگ رہی ہے۔ میں آپ کے لیے کمبل لاؤں۔" بھائی جان نے پوچھا۔ "ہاں بیٹے کمبل لا ہی دو، سردی کافی محسوس ہو رہی ہے۔" داداجان نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ بھائی جان کمبل لانے کے لیے اسٹور روم کی طرف چلے گئے۔ اسٹور روم سے کمبل نکالتے ہوئے ان کی نظر رضائیوں کے پیچھے پڑی۔ گڑیا وہاں سو رہی تھی۔ کمبل نکالنے کے لیے انھیں دو تین رضائیاں اُتارنی پڑی تھیں۔ اسی لیے وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اُوپر تک رضائیوں کی موجودگی کی وجہ سے ہی وہ کسی کو نظر نہیں آئی تھی۔ انھوں نے گڑیا کو آہستگی سے دونوں ہاتھوں پہ اُٹھا لیا۔ نیند کے عالم میں اُس کا معصوم چہرہ پریوں جیسا لگ رہا تھا۔ رونے کی وجہ سے آنسوؤں نے دونوں گالوں پر لکیریں سی بنا دی تھیں۔ انھوں نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ جیسے ہی وہ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ امّی چیختی ہوئی اُن کی طرف آئیں "ہائے میری بچی" وہ اُسے بے تحاشہ چومنے لگیں۔ گڑیا کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے اوپر امّی کو جھکتے ہوئے دیکھ کر وہ سہم گئی "امّی... امّی میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ ڈونگا میں نے نہیں توڑا۔ امّی آپ میرا یقین کریں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" گڑیا ایک دم رونے لگی۔

"مجھے پتا ہے میری گڑیا نے ڈونگا نہیں توڑا مجھے یقین ہے۔ مجھے اپنی بیٹی پر بھروسہ ہے وہ جھوٹ نہیں بولتی۔" امّی اُسے اپنی گود میں لیتی ہوئی بولیں۔ "امّی آپ کو یقین آ گیا میری بات پر" وہ رونا بھول کر حیرانگی سے امّی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "بالکل بیٹی اور اب آئندہ تمہیں میں کبھی نہیں ماروں گی۔ کبھی بھی نہیں" امّی نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔ "سچ امّی" خوشی سے اُس نے دونوں بانہیں امّی کے گلے میں ڈال دیں۔ داداجان، ابّو، بھائی جان، باجی اور ٹیپو میاں سب کے چہرے مسکرا اُٹھے۔

سڑکوں اور دیواروں پر پان کی پیک تھوک کر مصوّر بننے کی کوشش نہ کیجیے۔ پان کی پیک مناسب جگہ پر تھوکیے۔

اچھے بچے کی دُعا

نظر زیدی

خدایا میری زندگی جگ مگا دے!
مجھے نیک، پاک اور اچھا بنا دے!
جیوں تو فقط تیری خاطر جیوں میں
مروں تو تیرے راستے پر مروں میں
محبّت اگر ہو تو بس تیرے دیں سے
کوئی اور رشتہ نہ جوڑوں کہیں سے
نہ لالچ کروں اور نہ حرص و ہوس ہو
مجھے ایک تیرا بھروسہ ہی بس ہو
مجھے بزدلی سے بچانا خدایا
مجھے اک مجاہد بنانا خدایا
جو بے کس ہیں دل سے کروں اُن کی خدمت
یتیموں، غریبوں سے ہو مجھ کو اُلفت
جو مغرور ہیں اُن کو نیچا دکھانا
جو ظالم ہیں، تو اُن کے شر سے بچانا!
صداقت کے رستے سے بھٹکوں نہ یارب
شرافت کی باتوں کو چھوڑوں نہ یارب
خدایا، بڑھا شان میرے وطن کی
جہاں جائیں تعریف ہو اس چمن کی
میں عاجز ہوں کمزور ہوں اور بُرا ہوں
تو اچھا بنا دے کہ بندہ ترا ہوں

فرحین نگار

میرا دوست

ایک کہانی جس کے اختتام پر آپ چونک اُٹھیں گے

"ابّو ٹرین چار بجے ہی آئے گی نا!" میں نے جب تیسری بار ابّو سے یہی سوال کیا تو برابر بیٹھے اسلم بھائی جھلا کر بولے۔ "ہاں ... ہاں۔ کیا تمہیں لکھ کر دے دیں کہ ٹرین چار بجے ہی آئے گی۔ آخر تم اس قدر بے چین کیوں ہو؟ کون سا تمہارا دوست اکرم آرہا ہے"۔ "اکرم نہیں آرہا تو کیا ہوا۔ عمران تو آرہا ہے وہ اکرم کا پڑوسی ہے بالکل اکرم کا ہم عمر اور بقول اکرم کے ہم شکل بھی۔ عمران میرے لیے اکرم جیسا ہی ہے"۔ میں نے ایک بار پھر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے ابّو نے کہا۔ "ارشد تم نے ہاسٹل میں بات کر لی ہے"۔ "جی ابّو بس عمران آج رات ہمارے پاس رہے گا کل دوپہر بارہ بجے اس کو ہاسٹل میں کمرہ مل جائے گا۔ ابّو۔ اکرم نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اس کے دوست کو اپنے گھر ایک رات ٹھہرنے کی اجازت دے دوں۔ ٹھیک ہے نا ابّو"۔ میں نے ایک بڑے مان سے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے اچھا اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ اور چار بجے تیار رہنا کہیں لیٹ نہ ہو جائیں"۔

اکرم اور میرا سات سال کا ساتھ ہے ۔ وہ میرا بڑا گہرا دوست تھا ۔ ہم دونوں ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس میں تھے ۔ اکرم اپنی امی کے ساتھ رہتا تھا ۔ شروع میں مَیں سمجھتا تھا کہ اکرم کے والد ملک سے باہر رہتے ہیں لیکن کچھ عرصے پہلے پتا چلا کہ وہ لاہور میں رہتے ہیں اور اب کی دفعہ جب ہمارا سالانہ رزلٹ نکلا تو اکرم نے بتایا کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے لاہور جا رہا ہے اپنے ابو کے پاس، تاہم وہ مجھے وہاں سے خط لکھتا رہے گا اور اگر کبھی کراچی آنا ہوا تو مجھ سے ضرور ملنے آئے گا ۔ یہ سُن کر میرا دل بیٹھنے لگا ۔ کیا میری اور اکرم کی دوستی ختم ہو جائے گی ۔ آنسو میری آنکھوں سے نکلنے لگے یہی حال اکرم کا بھی تھا ۔۔۔ اکرم کو گئے ہوئے اب تقریباً دو مہینے ہو گئے ہیں ۔ اس عرصے میں میرے پاس اکرم کے پانچ خطوط آ چکے ہیں ۔ جس میں اس کے دوست عمران کا بھی خاصی تفصیل سے ذکر ہے ۔ میں نے ٹائم دیکھا تین بج چکے تھے ۔ ایک گھنٹہ کیا کروں ۔ عمران سے ملنے کے اشتیاق میں نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ یہ سوچ کر کہ کچھ پڑھنا چاہیے ۔ دراز کھولی تو اکرم کے پانچوں خط پڑے تھے ۔ میں نے ان کو ترتیب وار کیا اور ایک بار پھر ان کو پڑھنے بیٹھ گیا ۔

۵، مارچ　　　　پیارے دوست ارشد

السلام علیکم

امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گے اور مجھے یاد کرتے ہو گے ۔ مجھے تمہارا ہر وقت خیال رہتا ہے ۔ ہم لوگوں کو لاہور آئے ہوئے دو دن ہو گئے ہیں ۔ ابّو سے مل کر اتنی خوشی ہوئی ہے کہ بس میں اس کو لفظوں میں نہیں بیان کر سکتا ۔ امی بتا رہی تھیں کہ جب میں بہت چھوٹا تھا تبھی ابو کا تبادلہ ہو گیا تھا ۔ اسی وجہ سے میں اُن سے نہیں مل سکا ۔

ہم لوگ جس گھر میں رہتے ہیں ۔ وہ بہت اچھا ہے خاص طور پر اس کا لان تو کافی بڑا ہے اور اس میں ایک جھُولا بھی ہے ۔ میں جب بھی اُس جھُولے پر بیٹھتا ہوں مجھے وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے ۔ جب ہم دونوں چھُپ کر سامنے والے پارک میں جھُولا جھُولنے جایا کرتے تھے ۔ سفر کی وجہ سے میں بہت تھک گیا ہوں ۔ امّی جانے کیوں آج کل کچھ پریشان پریشان سی ہیں ۔ شاید وہ بھی سفر اور گھر کلیننگ سے تنگ گئی ہوں گی ۔۔۔ ہمارے سامنے والے گھر میں ایک لڑکا عمران رہتا ہے ۔ وہ لوگ کافی غریب ہیں ۔ ویسے میں اس سے جلد ہی دوستی کر لوں گا ۔ اچھا باقی تفصیل اگلے خط میں ۔ جواب ضرور دینا ۔ میں انتظار کروں گا

خدا حافظ　تمہارا دوست ۔ اکرم

۱۵ر مارچ پیارے دوست ارشد

اسلام علیکم

آج ہی تمہارا خط ملا اور میں لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے ہیں۔ میرا اسکول میں ایڈمیشن ہو گیا ہے اتنا بڑا اور اچھا اسکول ہے کہ بس کیا بتاؤں اور یونیفارم پہن کر میں بہت اسمارٹ لگتا ہوں۔ اور وہ جو عمران ہے نا جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ جس کا میں نے پہلے ذکر کیا تھا۔ آج میں نے دیکھا وہ بھی اسکول جا رہا تھا، لیکن اس کا اسکول مجھے پسند نہیں آیا۔ وہاں پر سارے غریب بچے پڑھتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اُس سے چڑ سی ہو گئی ہے وہ مجھے بالکل لفٹ نہیں کراتا۔ شاید وہ مجھ سے ڈرتا ہے۔ اگر وہ میرے اسکول میں آجائے تو میں اُس سے دوستی کروں گا۔ اچھا باقی باتیں بعد میں ...

خدا حافظ

تمہارا۔ اکرم

۳۰ر مارچ پیارے دوست ارشد

اسلام علیکم

میں تمہارے خط کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ ایسی بھی کیا مصروفیت۔ کچھ وقت نکال کر خط کا جواب تو کم از کم دے دیا کرو۔ اچھا میں سمجھ گیا کہ تمہارے Monthly Exams ہو رہے ہوں گے۔ لیکن اب اس خط کا جواب ضرور دینا۔

میں ان پندرہ دنوں میں کیا کرتا رہا۔ بس کیا بتاؤں۔ عمران کی امی کا انتقال ہو گیا ہے ایک دم سے میں اُن کے گھر گیا تھا۔ غربت ان کے گھر کی ایک ایک چیز سے ٹپک رہی تھی۔ عمران بہت رو رہا تھا۔ اُس کی امی کا علاج صحیح نہیں ہو سکا۔ وہ بتا رہا تھا کہ اُس کے ابو بہت ظالم ہیں اور اُس کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ اور اب وہ شاید اسکول بھی چھوڑ دے گا۔ وہ ہر وقت اپنے کسی دوست کو یاد کرتا ہے مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ اچھا اب میں خط ختم کرتا ہوں۔ ماسٹر صاحب آنے والے ہیں۔ مجھے ابھی ان کا کام بھی کرنا ہے۔

خدا حافظ

تمہارا اکرم

۱۰ر اپریل پیارے دوست ارشد

اسلام علیکم

کل تمہارا خط ملا۔ تمہارا رزلٹ پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ تم اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئے ہو۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں عمران کی وجہ سے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ شاید اُس کے ابّو اُسے گھر سے نکال دیں۔ میں نے اُسے مشورہ دیا ہے کہ تم کراچی چلے جاؤ وہاں ہاسٹل میں رہ لینا۔ میں نے اُسے کچھ پیسے بھی دیے ہیں۔ وہ بہت کمزور ہو گیا ہے۔

۱۵ اپریل

پیارے دوست ارشد

اسلام علیکم

مجھے ابھی تک تمہارا جوابی خط نہیں ملا ہے لیکن میں تمہیں پھر بھی اس لیے خط لکھ رہا ہوں کہ عمران لاہور کی عوامی ایکسپریس سے ۲۰ اپریل کو سوار ہو کر ۲۲ اپریل کو کراچی پہنچے گا۔ وہ میری ہی عمر کا ہے۔ میرے جتنا اس کا قد ہے تم اُسے اسٹیشن پر ریسیو Receive کر لینا اور اس کے لیے اپنے اسکول کے ہاسٹل میں کمرے کے لیے بھی بات کر لینا۔ تم اُسے دیکھتے ہی پہچان لو گے۔ وہ نیلی جینز اور زرد رنگ کی ٹی شرٹ پہنے ہو گا۔ اچھا اب میں خط ختم کرتا ہوں۔ اسے اسٹیشن پر لینے ضرور جانا۔

تمہارا۔ اکرم

اور آج ۲۲ اپریل ہی ہے۔ خطوط پڑھنے کے بعد میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے ہی والے ہیں۔۔۔ "ارشد بیٹا جلدی کرو"۔ ابّو نے مجھے آواز دی۔ میں جلدی سے تیار ہو کر باہر کی طرف بھاگا۔ ابّو باہر گاڑی میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ اسٹیشن پر بڑا رش تھا۔ ٹرین بس پہنچنے ہی والی تھی۔ عمران سے ملنے اور دیکھنے کا شوق بڑھتا جا رہا تھا۔

ٹرین رُکتی گئی اور پھر بالکل رُک گئی۔ لوگ برابر ٹرین میں سے اُتر رہے تھے۔ لیکن مجھے ایسا کوئی لڑکا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس نے زرد ٹی شرٹ اور نیلی جینز پہنی ہو۔ بالآخر آخری ڈبے سے ایک لڑکا نکلا جس نے مطلوبہ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ "عمران"۔۔۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔۔۔ "نہیں اکرم"۔۔۔ میرے سامنے اکرم کھڑا تھا۔ زرد ٹی شرٹ پہنے ہوئے اور ایک دم سے میرے ذہن میں وہ سارے خطوط سامنے آ گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا۔ تو عمران یہی اکرم تھا۔ اپنے عزیز دوست کی بے بسی پر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ تب ابّو نے اکرم کو گلے لگاتے ہوئے کہا کہ "بیٹا یہ تم نے بہت عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے۔ ارشد نہ صرف تمہارا دوست بلکہ بھائی بھی ہے! تم کسی ہاسٹل میں نہیں رہو گے بلکہ ہمارے گھر میں ارشد کے ساتھ رہو گے۔"

وعدہ

محمد سلیم مغل

آخری حصّہ

مُراد کے والد ایک اصُول پسند انسان تھے۔ وہ اُسے نصیحت کرتے کہ اچھے کام کرنا چاہیے تاکہ تمہارا شمار بھی اچھے لوگوں میں ہو۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنے اللہ سے وطن کی خاطر جینے اور مرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اور میں اس وعدے کو ضرور پورا کروں گا۔ مُراد کا خاندان سندھ کے ریگزار تھرپارکر کے قریب ایک قصبے میں رہا کرتا تھا۔ اُس کے والد مہران خان نے اپنی زندگی کے بیس سال فوج میں گزارے تھے۔ اب وہ ریزرو فوجی کی حیثیت سے اپنے گھر پر تھے۔ ستمبر کی ایک صبح ریڈیو پر اعلان ہوا کہ پڑوسی ملک نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ قصبے کے سبھی جوان اور ریزرو فوجی قافلے کی شکل میں وطن کی حرمت پر مر مٹنے کا عزم لے کر سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ اُن میں مہران خان بھی تھے۔ چند روز بعد آدھی رات کے وقت گاؤں میں ریڈکراس کی ایک ایمبولینس آکر رُکی۔ ایک فوجی افسر نے اعلان کیا کہ ایک مجاہد شہید ہوگیا ہے۔ ہر شخص شہید کا نام جاننے کے لئے مضطرب ہوگیا۔ اب آپ آگے پڑھئے۔

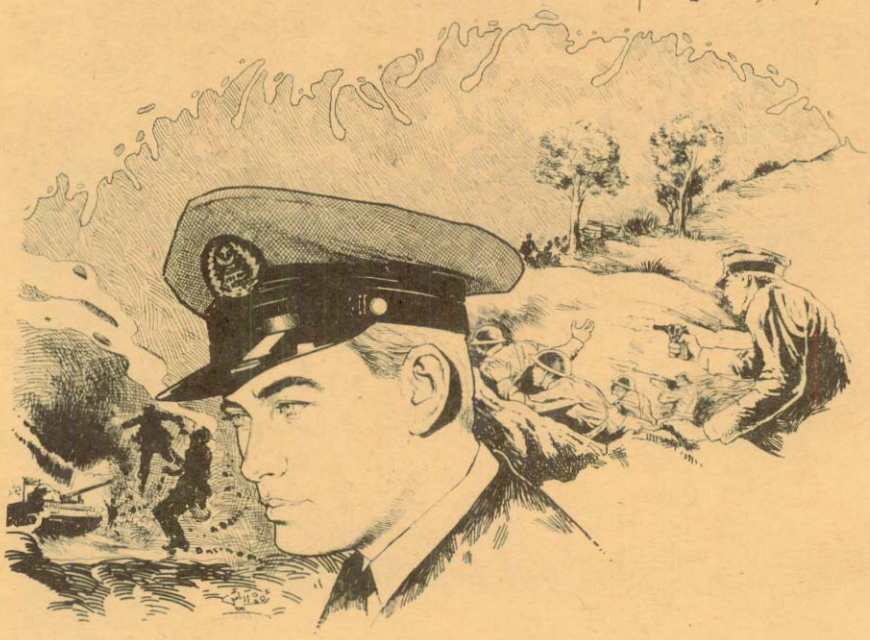

جنگ شروع ہوئے تیرہ دن ہو چکے تھے۔ ہر آنے والا دن کامیابیوں اور فتوحات کی خبریں لے کر آ رہا تھا۔ اس لیے پاک فوج کی طرح پاک شہریوں کے حوصلے بھی بلند تھے۔ مساجد میں، گھروں میں ہر جگہ کامیابی اور کامرانی کی دُعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ ریڈیو ایسے پروگرام نشر کر رہا تھا جس سے دلوں کی دنیا میں جذبۂ جہاد کی لہریں موجزن رہیں، اور واقعی لوگ پُرجوش تھے، پُرعزم تھے اور دفاعِ وطن کے لئے ہر لمحہ تیار اور کامران۔

مُراد بھی کبھی پُرعزم ہو جاتا اور کبھی اُس کی آس ٹوٹنے لگتی۔ اس نے جب سے سُنا تھا کہ ایک مجاہد اس قصبے کا شہید ہو گیا ہے۔ نہ جانے کیوں اُسے دھڑکا سا لگ گیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بہت پریشان ہو جاتا۔ مراد کب سے کروٹیں لے رہا تھا۔ مگر اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کے بارہ تو بج چکے ہوں گے۔ اُس نے گھڑی دیکھی... رات کے دو بج چکے تھے۔

اچانک کسی گاڑی کی آواز سن کر وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے چھت پر چڑھ کر دیکھا... ایک ٹرک اُس کے گھر کے قریب آ رہا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں... "خدا خیر کرے..."

ٹرک جوں جوں گھر کے قریب آتا، اُس کی پریشانی بڑھتی چلی جاتی۔ تھوڑی دیر بعد فوج کے جوان ٹرک پر سے ایک میّت کو اُتار رہے تھے... یہ شہید مہران خان کی لاش تھی۔ سب پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ پورا قصبہ جمع ہو چکا تھا۔ گھر میں آہیں اور سسکیاں سُنائی دے رہی تھیں۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہر نظر مہران خان کے سینے پر تھی۔ جہاں گولی اور خون کے نشان نے مِل کر شجاعت کا ایک تمغہ سا بنا ڈالا تھا۔ مُراد اپنے والد کی لاش سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔ بِلک بِلک کر روتے ہوئے بچے کو دیکھ کر کوئی بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔

گاؤں کے مولوی صاحب سب کو سمجھا رہے تھے۔

"مہران خان کو مُردہ نہ سمجھو، یہ شہید ہے۔ شہید زندہ ہوتے ہیں مگر ہمیں اس کا شعور نہیں ہے... شہیدوں کے لئے اللہ کے ہاں بڑا انعام ہے۔ مُراد تم شہید باپ کے بیٹے ہو۔ رو نہیں بیٹا۔ فخر کرو اپنے شہید اور بہادر باپ پر۔"

مُراد کے کانوں میں اپنے بابا سائیں کے وہ الفاظ گونجنے لگے۔

"میں نے اپنے اللہ سے وطن کی خاطر جینے اور مرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ میں اس وعدے کو ضرور پُورا کروں گا۔"

جنگ ختم ہوگئی۔ یہ جنگ بڑی قربانیوں کے بعد ہم نے جیت لی تھی۔ دشمن اپنے ناپاک عزائم کو پُورا نہ کر سکا تھا۔

جنگ جیتنے کی خوشی کسے نہ تھی۔ مُراد بھی خوش تھا۔ مگر بابا کی یاد سے اُس کی آنکھوں میں آنسو ضرور آجاتے۔

دن گزرتے رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ جُدائی کا زخم بھی ہلکا ہوتا رہا۔ مُراد اب نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اس کی بہن سکینہ دسویں پاس کر چکی تھی۔ مُراد اسکول کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لینے لگا۔ ایک روز اسکاؤٹنگ کا حلف لیتے ہوئے جب اسکول کے بڑے سے ہال میں، اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے "میں اپنی آن پر وعدہ کرتا ہُوں..." تو اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُسے بابا یاد آگئے جو اکثر کہتے تھے "بیٹا جو وعدہ کرو اُسے ہمیشہ پُورا کرنا۔" اُس نے ایک عزم کے ساتھ دہرایا۔

"میں اپنی آن پر وعدہ کرتا ہوں کہ اللہ اور اُس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلم اور پاکستان کے عائد کردہ فرائض کی پابندی کروں گا۔ دوسروں کی مدد اور اسکاؤٹ قانون کی پابندی میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔"

دسویں جماعت میں اوّل آنے کے بعد کالج میں داخلہ لینے کے سلسلے میں کوئی دقّت نہ ہوئی۔ اسی طرح بارہویں جماعت کے بعد وہ چاہتا تو ڈاکٹر بن سکتا تھا، کیونکہ اس کے نمبر بہت اچھے آئے تھے۔ مگر اُس نے ڈاکٹر بننے کے بجائے اپنے بابا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فوج میں جانے کو ترجیح دی۔

کاکول اکیڈمی سے جب وہ اپنی اماں اور سکینہ یا ساون کو خط لکھتا اور اپنی تربیت کے دوران کی تصویریں بھجواتا تو وہ خوشی سے پھُولے نہیں سماتے... اور مُراد کی تصویریں محلّے بھر کو دکھا کر سکھ کا چین لیتے... مُراد اب بچّہ یا لڑکا نہیں بلکہ نوجوان نظر آتا تھا، دراز قد، بھرا جسم، سوہنی رنگت اور حسین وجاہت۔ اس کی تازہ تصویر دیکھ کر اماں کی آنکھیں چمک اُٹھیں... "بالکل اپنے ابا پر گیا ہے بالکل ویسا ہی ہے۔" اماں نے تصویر کو چُوما اور دُعائیں دیتے ہوئے صدقے کی رقم ساون کو دی کہ جا کر مولوی صاحب کو دے آئے۔

اُدھر مُراد بھی اکیڈمی میں اپنی تربیت مکمل کر چکا تھا۔

پاسنگ آؤٹ کی خوبصورت تقریب میں جب وہ حلف لے رہا تھا تو اُس کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگ گئیں۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ اپنے اللہ کے علاوہ اپنے بابا کے سامنے بھی کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ بابا سائیں

جو وعدہ بھی کروں گا اُسے پُورا کروں گا۔

"وقت پڑنے پر اپنے مُلک کی خاطر، اپنی قوم کی خاطر جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کروں گا..."

اب وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ بن چکا تھا۔ اپنی خوبصورت وردی میں تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بھلا لگ رہا تھا۔ اس وردی میں ملبوس وہ گھر میں داخل ہُوا تو آتے ہی اپنی اماں کے قدموں میں گر گیا۔

کئی سال تک مُلک کے طول و عرض دیکھنے کے بعد ایک روز مُراد کو ترقی اور تبادلے کے احکامات ایک ساتھ مِلے۔ اب وہ کیپٹن مُراد تھا اور اُس کی خدمات بلوچ رجمنٹ کے بجائے سندھ رینجرز کے حوالے کی گئی تھی۔ اس کا نیا اسٹیشن رحمکی بازار تھا... یہ علاقہ سندھ کے ریگستانی علاقے کی ایک سرحدی چوکی ہے۔

کرنل سعید نے کیپٹن مُراد کا شانہ تھپتھپایا اور مبارک باد کہتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ "تمہیں بڑے چیلنج کا مقابلہ ہے۔"

"کیسا چیلنج سَر!" کیپٹن مُراد نے تجسّس سے پوچھا۔

"ہمارے مُلک کے کچھ تخریب کار اور کچھ سیاسی تنظیمیں پڑوسی مُلک سے بڑے پیمانے پر اسلحہ ہمگل کرنا چاہتی ہیں۔

انٹیلی جینس کی اطلاع تو یہ بھی ہے کہ تازہ ترین تخریب کاری میں استعمال ہونے والا اسلحہ اسی راستے سے آیا ہے۔ دشمن بہت چوکس ہے اور اس کی منصوبہ بندی خطرناک حد تک ماہرانہ ہے۔ ہمارے علاقے کے بڑے چھوٹے بیشتر شہروں کے چُنگی ناکوں کے ٹھیکے ہندوؤں نے لے رکھے ہیں۔ تاکہ راستوں پر ان کی نظر گڑی رہے۔ ان ہندوؤں کے روابط مخصوص سیاسی گروہوں سے ہیں۔ ہوشیار کیپٹن مُراد، ہر چُنگی ناکہ دشمن کا ٹرانسمٹ اسٹیشن ہو سکتا ہے۔"

کیپٹن مُراد کرنل سعید کی باتیں پُوری توجہ اور رہنمائی سے سُن رہا تھا۔ ہر ایک جُملے کے بعد وہ فوجی طریقوں کے مطابق یس سر، یس سر کہتا جاتا۔

"اور ہاں آرمی انٹیلی جینس اور ہمارے آدمی تمہاری مدد کے لیے موجود ہیں... اللہ نگہبان..."

رحمکی بازار کیپٹن مُراد کا نیا اسائنمنٹ تھا۔

"یہاں آپ سے پہلے دو کپتان ناکام ہو چکے ہیں سر!" ایک حوالدار نے نئے آنے والے کیپٹن کو

ہوشیار کرنا چاہا۔ "مجھے سب پتا ہے ..." کیپٹن نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"سر اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالیں سر" ریٹائرمنٹ کے دھانے پر کھڑے ہوئے حوالدار نے اپنے تجربے کی روشنی میں کیپٹن مُراد کو اس کی منصوبہ بندی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"مزید کچھ نہ کہنا ... اور سُنو میرے اُستاد بننے کی کوشش نہ کرو۔ ایسی بات جوان کو زیب نہیں دیتی۔" مُراد نے انتہائی سخت لہجے میں یہ بات حوالدار سے کہی اور حوالدار خاموش ہو گیا۔

چند ہی روز میں کیپٹن مُراد نے اپنے ساتھی کیپٹن طالب کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ اس منصوبے میں جاسوسی کے نظام کو مؤثر بنانا اور اس چوکی پر موجود پُرانے جوانوں یا رینکرز کو ہٹانا خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ معاوضہ لے کر اطلاعات پہنچانے والے مخبروں سے کیپٹن مُراد نے روابط قائم کر لئے تھے اور بلند ترین بھٹ (ریت کی پہاڑی) پر موجود اوپی کو چوکنا کرنے کے علاوہ خصوصی ٹیم پیٹرولنگ پر لگا دی گئی تھی۔ ان تمام انتظامات کا ایک فائدہ یہ ہُوا کہ چند روز میں دو بار بڑی تعداد میں اونٹوں کے لیے قافلے اور مویشیوں کے ریوڑ پکڑ لیے گئے جنھیں اسمگلنگ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

کیپٹن مراد کی قیادت میں جو سامان پکڑا گیا تھا۔ اُن میں بیڑی کا پتہ، الائچی، کاجُو، صندل کا سامان اور بنارسی ساڑھیاں خاص طور پر بڑی مقدار میں شامل تھیں۔ اس کامیابی پر مُراد کو ہیڈ کوارٹر کی طرف سے مبارک باد کے خطوط اور افسرانِ بالا کی طرف سے شاباش مل چکی تھی۔ مگر اُس کا اطمینان ابھی تک نہیں ہُوا تھا۔ وہ اکثر کیپٹن طالب سے کہتا کہ "مجھے سچی خوشی اُس روز حاصل ہو گی جب میں اسلحہ کے اسمگلروں کو ٹھکانے لگاؤں گا۔ یہی تو ہمارے اصل دشمن ہیں۔ یہی تو ہیں جنھوں نے بھائی کو بھائی سے لڑا دیا ہے۔ ہمارے علاقے کا امن برباد کر دیا ہے۔ میں انھیں نہیں چھوڑوں گا۔ ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز جذبات کی شدت سے تیز ہو جاتی اور وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ جاتا۔

بالآخر وہ گھڑی آ گئی جس کا انتظار تھا۔ مُخبر نے اطلاع دی کہ آج رات کسی بھی وقت دُشمنوں کا گروہ اسلحہ اسمگل کر رہا ہے۔ اسلحہ کس طرح آئے گا۔ اور کتنی مقدار میں آئے گا اس کی بابت کچھ پتا نہ چل سکا۔

فوجی گشت اور سرحدی پہروں میں اضافہ کر دیا گیا۔ کیپٹن مُراد ایک مشین گن کے ساتھ خود ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک جاتا اور رات کی تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا۔ اس کے ساتھ دو جوان تھے۔ جنھوں نے اپنی رائفلوں کے علاوہ ایک چھوٹا سا وائرلیس

سیٹ اُٹھا رکھا تھا

پوری رات بیت گئی مگر سرحد کی اُس جانب سے کوئی نہ آیا۔ صبح فجر کے وقت مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں کیپٹن مراد ایک مورچے کے پاس فوجی کمبل بچھا کر لیٹ گیا تاکہ کچھ وقت آرام کرلے ... ابھی اُس کی آنکھ لگی بھی نہ ہوگی کہ قریب ہی سے فائرنگ کی آواز سُنائی دی پھر یہ آواز بڑھتی گئی۔ کیپٹن مراد اُٹھ کر آواز کی سمت لپکا۔ رینجرز کے گشتی جوانوں اور اسمگلروں کے درمیان سخت فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ اسمگلر اونٹوں پہ سوار بھی تھے اور پیدل بھی، مگر اُن کے پاس اسلحہ بے انتہا اور جدید ترین تھا۔ دونوں طرف سے ہونے والی فائرنگ کی آواز ہی سُن کر ایسا لگتا جیسے یہ معرکہ اسمگلروں سے نہیں بلکہ دشمن پڑوسی مُلک سے ہو رہا ہو۔

کیپٹن مراد کا منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے دو روز قبل ایک اسمگلر سے ملاقات کر کے بڑی رقم بطورِ معاوضہ لی تھی اور انہیں سرحد عبور کرنے کی اجازت دے دی تھی مگر یہ سارا کام مُراد نے اس ذہانت سے کیا کہ اسمگلروں کو اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکا کہ رشوت کی رقم قبول کر لینا کیپٹن مراد کے منصوبے کا ایک حصّہ تھا ... تمام اسمگلر کیپٹن مراد کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس چکے تھے۔ رینجرز کے جوانوں کا گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا تھا مگر اسمگلرز کی جانب سے فائرنگ کی شدّت میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مرنے یا مار دینے کے ارادے سے آئے ہوں

اِدھر کیپٹن مُراد کا بھی یہی عالم تھا وہ چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایت دیتا۔ کبھی وائرلیس پر اپنی خفیہ زبان میں کوئی بات کرتا اور کبھی رینگتا ہُوا آگے بڑھتا اور مشتبہ جھاڑیوں اور ان کے پیچھے موجود اسمگلرز پر فائرنگ کرتا .... یہ عمل کافی دیر تک جاری رہا۔ مُراد کو یقین تھا کہ اسمگلرز یا تو کافی تعداد میں مَر چکے ہیں یا زخمی ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اس جانب سے مزاحمت میں کافی کمی آگئی تھی

اُسی لمحے ایک گولی مُراد کے پیٹ پر آکر لگی اور اُسے لہولہان کر گئی۔

مراد کو ہوش آیا تو اُس نے محسوس کیا کہ وہ اسپتال کے کسی بستر پہ دراز ہے ... یہ سی ایم ایچ کا انتہائی نگہداشت کا وارڈ تھا، جہاں ڈاکٹرز کی تین دن کی سر توڑ کوشش کے بعد بالآخر کیپٹن مُراد کو ہوش آ گیا تھا ... اُس کی طبیعت آہستہ آہستہ بہتر ہونا شروع ہو گئی مگر ابھی تک کسی کو اس کے قریب آنے کی اجازت نہ تھی۔ مُراد نے بستر پر لیٹے لیٹے دیکھا باہر کرنل سعید اور چند دیگر افسران کھڑے ہوئے اُسے تک رہے تھے۔ مُراد کی نظریں کرنل سعید پر پڑیں تو کرنل نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی پانچوں انگلیوں کو پیار کیا اور ہاتھ کو

ہوا میں لہرایا۔ وہ سمجھ گیا یہ شاباش تھی۔ مگر وہ بے چین تھا کہ معرکے کا انجام کیا ہوا۔ اسمگلرز پکڑے گئے یا نہیں؟

اگلے ہی لمحے کیپٹن طالب نے V کا نشان بنا کر مراد کو دکھایا۔ یہ فتح کا نشان تھا یعنی "ہم کامیاب ہوئے"۔ مراد کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔

●

انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے باہر آنے پر تمام افسران اُس کے گلے لگ گئے اُسے پیار کیا اور بتایا کہ "تم نے پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا اسمگلنگ کیس پکڑا ہے۔ تمہیں مبارک ہو۔"

کیپٹن مراد نے پوچھا "اسمگلروں کو پکڑ لیا گیا؟"

"ہاں..." کیپٹن طالب نے جواب دیا "نہ صرف اسمگلر بلکہ ان کی مدد سے ان کے کارندے اور سرغنہ بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔"

"کیا میں اس سرغنہ کو دیکھ سکتا ہوں"؟

"ہاں کیوں نہیں... ؟ تم نہیں دیکھو گے تو اور کون دیکھے گا...؟"

اگلے روز سی ایم ایچ کے اسپیشل روم میں زخمی مُراد کے سامنے اسمگلروں کے سرغنہ کو پیش کیا گیا۔

"نہیں... یہ نہیں ہو سکتا..." مُراد نحیف آواز میں چلایا... "ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم اسمگلر نہیں ہو سکتے..."

اسپتال کا عملہ اور چند دیگر افسران کیپٹن مراد کو اس عالم میں دیکھ کر محوِ حیرت بنے ہوئے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔؟ کیپٹن مراد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اسمگلروں کا سرغنہ آگے بڑھا اور مُراد کے سینے سے لگ گیا۔ یہ مانجھی تھا، مُراد کا بڑا بھائی۔ باپ کا نافرمان۔

"تم نے یہ کیا کیا مُراد؟" مانجھی نے مُراد کو زخمی دیکھ کر رُندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا... بس اپنا فرض پورا کیا ہے۔ اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔

اپنے اللہ سے کیا ہوا وعدہ... اپنے بابا سائیں سے کیا ہوا وعدہ... اپنی پاک دھرتی اور اس کے رہنے والوں سے کیا ہوا وعدہ..."

علاج دن بہ دن مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے۔

صحت مند جسم ہی صحت مند خیالات کی ضمانت ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے۔

دلچسپ اور عجیب

برمائی انسان

رضاء اللہ طالب

"۱۲ اگست ۱۹۵۸ء کا ذکر ہے میں دریائے بیلائیڈگ کی وادی میں گھوم رہا تھا۔ اچانک ایک حیرتناک منظر دکھائی دیا۔ پانچ سو میٹر دور وادی کی جنوبی ڈھلوان پر ایک انسان نما بیولا متحرک تھا۔ اس کی پشت جھکی ہوئی تھی۔ سفید برفانی پس منظر میں وہ اپنی ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کے بازو عام آدمیوں کے بازوؤں سے لمبے تھے۔ میں بے حس و حرکت کھڑا پانچ منٹ تک دیکھتا رہا۔ پھر وہ ایک چٹان کے پیچھے غائب ہو گیا۔"

یہ الفاظ اے جی پرونن کے ہیں وہ لیفن گراڈ یونیورسٹی میں ہائیڈرالوجسٹ ہے اس نے پامیر کے علاقے میں گلشیئر کے کنارے جس مخلوق کو دیکھا تھا۔ اسے "یتی" کہتے ہیں۔ پرونن اپنی یادوں کو ٹٹولتے ہوئے کہتا ہے۔

"تین دن بعد اسی جگہ شام کے وقت یہ بیولا میں نے دوبارہ دیکھا۔ اب کے وہ ایک غار میں داخل ہو کر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک ہفتے بعد میں یونیورسٹی کی طرف سے ایک تحقیقاتی مہم پر پھر یہاں آیا۔ میرے ساتھ

کچھ مزدور بھی تھے۔ ہم دن بھر کھدائی کے کام میں مصروف رہے شام کو واپسی کا قصد کیا تو دیکھا کہ دریا میں سے ہماری ربڑ کی کشتی غائب ہے۔ ہم نے بہت تلاش کیا۔ مگر بے سود۔ کوئی مہینہ بھر بعد مجھے ازبک سائنس اکیڈمی کی ایک تحقیقاتی جماعت کے سربراہ کا پیغام ملا۔ یہ لوگ بھی اُسی علاقے میں گئے ہوئے تھے۔ پیغام میں لکھا تھا کہ انہیں دریا میں پانچ کلو میٹر اوپر کی طرف ربڑ کی کشتی مل گئی ہے۔ کسی کشتی کا پہاڑی طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اور دیا کے بہاؤ کے خلاف سفر کرنا ناقابلِ یقین واقعہ تھا۔ خیال آیا، ہو نہ ہو یہ سب یتی کی کارستانی ہے۔"

روس میں یتی کے بارے میں تحقیق گزشتہ صدی سے جاری ہے۔ منگولیا کا ایک یتی محقق کرنل پرجیو لسکی پہلا شخص تھا جس نے اس بارے میں حیران کُن شواہد جمع کیے۔

گزشتہ چند سال میں روسی ماہرین نے پرجیو لسکی کے کام کو خاصا آگے بڑھایا ہے۔ اس تحقیق کی روشنی میں "ہومنڈ" یعنی انسان نما مخلوق واقعی پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہماری رسائی سے باہر انتہائی دشوار گزار علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ روسی تحقیقات کا مرکز زیادہ تر قفقاز کا علاقہ ہے۔ ان جدید ترین مہموں کی رہنمائی ایک سائنسدان عورت پروفیسر جین فانا کافین کر رہی ہے۔ تاشقند کے مشرق میں بھی "یتی" کی تلاش کا کام جاری ہے۔

پروفیسر جین فانا کافین کو اب تک تین سو شہادتیں موصول ہو چکی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس عجیب و غریب مخلوق کو دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ چھوٹی موٹی باتوں میں یہ شہادتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ پروفیسر جین کافین کی تحقیق کے مطابق یہ مخلوق کرد کو کی وادی میں موجود ہے یہ نہ تو کوئی پالتو جانور ہے اور نہ انسان۔

مشہور روسی مورخ ڈاکٹر بورس پرشنیف کا کہنا ہے کہ بسا اوقات لوگوں نے "یتی" کو پکڑ کر انسانی بستیوں میں لا بسایا ایسے واقعات روس اور چین کے پہاڑی خطّوں میں ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۴ء، ۱۹۲۷ء، ۱۹۴۱ء اور ۱۹۵۴ء میں ملتے ہیں ان میں سب سے حیرت انگیز داستان زینا کی ہے۔ یہ کہانی گزشتہ صدی کے اواخر سے تعلق رکھتی ہے۔

زینا ایک مادہ یتی تھی۔ آج بھی ایسے کئی لوگ بقیدِ حیات ہیں جن کے سامنے اُسے پکڑا گیا جن کے درمیان وہ برسوں رہی۔ اوشامیر کے خطے میں تافینا گاؤں اُس کا مدفن ہے۔ اس گاؤں میں دس آدمی اب بھی ایسے موجود ہیں جو اس کی تجہیز و تکفین کی رسم میں شریک ہوئے اور سو سے زائد وہ لوگ ہیں جو کسی نہ کسی طور زینا کو جانتے ہیں۔

ابتداء میں زینا کو ایک محفوظ باڑے میں رکھا گیا۔ اس کی حرکات و سکنات جنگلی جانوروں کی سی تھیں۔ کسی شخص میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اُس کے سامنے کھانا رکھ سکے۔ بس دُور ہی سے روٹی کے ٹکڑے اس کی طرف پھینک دیے جاتے۔ اس نے زمین میں ایک گڑھا کھود لیا اور اس میں پڑ کر سو رہتی، یہ وحشیانہ حالت اس پر تین سال تک طاری رہی۔ پھر بتدریج اصلاح کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اب اُسے ایک مکان میں بند کر دیا گیا۔ کچھ عرصے تک اس کی

نگرانی کی جاتی رہی۔ آہستہ آہستہ اُسے گھومنے پھرنے کا موقع دیا گیا۔ وہ کبھی اپنے گھر سے دور نہ جاتی تھی۔

اس کی کھال سیاہ یا سیاہی مائل بھوری تھی۔ جسم سُرخی مائل سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سر پر گھنے سیاہ بال تھے۔ کئی سال تک اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی، نہ تو اس کے دانت گرے اور نہ بالوں کی رنگت ہی بدلی۔ اس کے دانت اس قدر مضبوط تھے کہ وہ سخت سے سخت شے بھی آسانی سے چبا ڈالتی۔ وہ گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑتی اور دریائے موکی میں خوفناک طوفان کے دوران بھی تیر سکتی تھی۔

زینا بچوں کی ماں بھی بنی۔ وہ ہمیشہ اپنے نومولود بچے کو دریا کے یخ بستہ پانی میں ڈبکیاں دیتی جس کی وجہ سے بدقسمت بچہ زندہ نہ رہتا۔

لوگوں نے بچوں کا یہ حشر دیکھا تو آئندہ ان کو بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب کبھی بچہ پیدا ہوتا، لوگ اُسے اُٹھا کر لے جاتے۔ اس طرح دو لڑکے اور دو لڑکیاں سلامت رہیں۔ انھوں نے انسانوں کی طرح بولنا اور کام کرنا سیکھ لیا۔ تاہم یہ بچے جسمانی اور ذہنی طور پر عام انسانوں سے ہٹ کر تھے۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک روسی جغرافیائی مجلس کی طرف سے ایک نوجوان سائنس دان بی... بی براوین منگولیا سے تبت ایک مشن پر روانہ ہوا۔ ایک شام قافلے کے رہنما نے ایک عجیب و غریب شے کو دیکھا جو پتیلے دھانے پر اُچھل کود رہی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ سب نے دیکھا وہ ایک لمبے بالوں والی بندر نما مخلوق تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اوجھل ہو گئی۔

۱۹۱۰ء کے لگ بھگ ایک نوجوان جیالوجسٹ وی اے خاکلوف کو دو قازقوں نے بتایا کہ وہ وسطی ایشیا میں ایک "وحشی انسان" کو قید میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ درمیانے قد کا ایک مرد تھا۔ اس کا سارا جسم "اونٹ" کی طرح بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ گھٹنوں سے نیچے تک پہنچتے تھے۔ پیشانی ڈھلوان تھی۔ ناک چھوٹی اور نتھنے بڑے بڑے تھے۔ پاؤں کے نشانات انسانوں کی طرح تھے لیکن جسامت میں ڈیڑھ دوگنا بڑے تھے۔

خاکلوف نے دریائے مناس کے قریب بھی اس قسم کا واقعہ سُنا۔ مقامی باشندوں نے ایک وحشی عورت کو قید کر لیا تھا۔ اس کی شکل و صورت ہُو بہُو چمپنزی سے ملتی تھی۔ وہ گاہے گاہے باتیں بھی کرتی۔ کوئی شخص اس کے نزدیک جاتا تو دانت پیستی ہوئی اس پر جھپٹ پڑتی۔ وہ اونٹ کی طرح گھٹنے اور پیشانی نیچے کر کے سوتی۔ اپنے ہاتھ گردن کے گرد حمائل رکھتی۔ زیادہ تر کچا گوشت کھاتی، لیکن آہستہ آہستہ روٹی شوق سے کھانے لگی۔ جونہی کوئی کیڑا مکوڑا اس کے قریب پہنچتا۔ جھپٹ کر اُسے پکڑ کر کھا لیتی۔ جب اُسے آزاد کیا گیا، تو وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے لڑکھڑاتی اور لمبے بازوؤں کو ہلاتی ہوئی قریبی پہاڑوں میں غائب ہو گئی۔

۱۹۲۸ء کے موسم گرما میں مشہور منگول سائنسدان پروفیسر رنچن، صحرائے گوبی سے گزرتے ہوئے ایک عورت کے ہاں ٹھہرا۔ جس کی عمر اُس وقت ستر سال تھی۔ اس نے رنچن کو بتایا کہ جب وہ بچہ تھی تو اُسے ایک یتی نے دُودھ پلایا تھا۔ پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"میرا باپ ایک قافلے کے ساتھ سنکیانگ گیا ہوا تھا۔ میری ماں مجھے گود میں لیے بھیڑیں چرایا کرتی۔ جہاں شام پڑتی وہیں ایک خیمہ نصب کر کے ہم رات گزارتے۔ ایک شام میری ماں نے مجھے خیمہ میں لٹایا اور خود بھیڑیں لانے کے لیے چلی گئی اچانک ایک عورت خیمہ میں داخل ہوئی، اُس نے مجھے گود میں لٹایا اور دودھ پلانے لگی۔ میں آج تک اس دُودھ کا ذائقہ نہ بھول سکی۔ میری ماں واپس آئی تو وہ اس وحشی عورت کو دیکھ کر چیخی چلائی۔ اس پر اُس نے مجھے نیچے لٹایا اور خود بھاگ گئی۔

پروفیسر رنچن کو بوڑھے گویل نے ایک واقعہ سنایا کہ کس طرح ایک یتی" نے صحرائے گوبی میں ایک انسان کو اغوا کر لیا تھا۔ ایک قافلہ جو وسطی منگولیا کی طرف جا رہا تھا۔ ایک روز گوبی میں ٹھہرا ایک شخص کو کہا گیا کہ وہ اونٹوں کو ہانک لائے۔ جب اُسے گئے خاصی دیر ہو گئی تو قافلے والے بڑے پریشان ہوئے ایک شخص اُسے ڈھونڈنے کے لیے اکیلا نکلا، لیکن ایک بوڑھے اور تجربہ کار آدمی نے اُسے روک دیا اور کہا "اس علاقے میں یتی پائے جاتے ہیں اس طرح اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں"۔ بوڑھے کی نصیحت پر تین آدمی تلاش میں نکلے اور پھرتے پھراتے غار کے ایک دھانے پر پہنچ گئے وہاں پاؤں کے نشانات سے واضح ہوتا تھا کہ جوتا پہنے ہوئے آدمی کسی ننگے پاؤں والے آدمی سے زور آزمائی کرتا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ لوگ خوفزدہ ہو گئے اور غار میں داخل ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔ انہوں نے جلد از جلد اونٹ جمع کئے اور کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے۔

کیمپ میں پہنچ کر انہوں نے سارا قصہ سنایا۔ بوڑھے آدمی نے بتایا "یتی جب انسان کو پکڑ لیتے ہیں تو پھر کئی دن تک غار سے باہر نہیں نکلتا۔ اس لیے اب وہاں جانا فضول ہے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ واپسی پر یتی سے دو دو ہاتھ کریں گے۔

واپسی پر ان لوگوں نے غار کے قریب پڑاؤ ڈالا تین آدمی بندوقیں لے کر غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ دن بھر کوئی شے اندر سے نہ نکلی۔ شام کے وقت "لمبے بالوں والا بے ڈھنگا" انسان باہر آیا۔ تینوں بندوقوں سے ایک ساتھ فائر ہوا۔ اور یتی ڈھیر ہو گیا۔

اب تینوں آدمی غار میں گھس گئے۔ انہیں اپنا ساتھی سخت وحشت کے عالم میں دکھائی دیا۔ وہ غیر معمولی

طور پر خاموش تھا۔ شاید وہ اپنی دردناک کہانی بیان نہ کرنا چاہتا تھا۔ گھر پہنچ کر بھی وہ کھویا کھویا سا رہا۔ اور لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے گریز کرتا۔ دو ماہ بعد وہ چل بسا۔

۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر پرشنیف نے مجھے ایک خط لکھا موضوع تھا: "غار کے باسیوں کا جھگڑا" اس نے یتی کے متعلق اپنی معلومات درج کی تھیں۔ پرشنیف نے جنرل میخائل سٹیپنووخ ٹامیسکی کی زبانی ایک پرانی کہانی بھی سنائی۔

۱۹۶۵ء میں میخائل کو شکست خوردہ اتحادی فوجوں کے تعاقب میں پامیر بھیجا گیا۔ بالائی خطوں میں روسی فوجوں نے "وحشی مخلوق" کے متعلق بہت سے قصے سنے۔ انہوں نے ننگے پاؤں کا بھی مشاہدہ کیا۔ ایک جھڑپ کے دوران میں روسی فوج کے ایک ازبک سپاہی نے جونہی مشین گن کا فائر کھولا۔ ایک غار سے ایک عجیب و غریب انسان چلاتا ہوا نکلا اور فائر کی زد میں آکر ہلاک ہوگیا۔ میخائل نے اس کا معائنہ کیا اس کا جسم انسانوں کے جسم سے ملتا تھا۔

پروفیسر رنچن کے قول کے مطابق جوں جوں تہذیب کی روشنی منگولیا کو منور کر رہی ہے یتی کی نسل کم ہو رہی ہے۔ مختلف جانور شجرِ حیات پر اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔ لیکن ان "وحشی برفانی انسانوں" کو کیا نام دیا جائے جو رفتہ رفتہ روایت بنتے جا رہے ہیں۔ ہم خلائی تحقیقات میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں مصروف ہیں جبکہ اسی زمین کے اسرار و رموز سے بخوبی طور پر آشنا نہیں ہو سکے۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

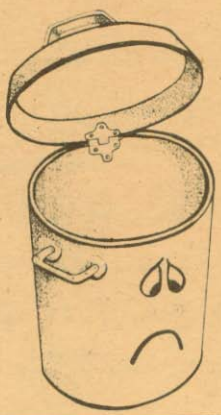

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے۔

چوتھے سیف گیمز ۱۹۸۹ء

سیف گیمز ... جنوبی ایشیاء کے ۷ ممالک کی علاقائی تنظیم "سارک" کا ایک حصّہ ہیں۔ ان کھیلوں کے انعقاد کا مقصد اس خطّے کے چھوٹے ممالک کے کھلاڑیوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر سکیں۔

سیف گیمز کی تاریخ ۵ برسوں پر محیط ہے۔ اس عرصے میں ۳ بار ان کھیلوں کا انعقاد ہو چکا ہے جبکہ چوتھے سیف گیمز اسی ماہ پاکستان میں منعقد ہو رہے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہمارے مُلک میں کھیلوں کا کوئی اتنا بڑا بین الاقوامی اجتماع ہو رہا ہے۔

عبدالرشید شکور

سات اقوام کے بہترین منتخب کھلاڑی

سُنہری تمغے اور دِل جیتنے کے لئے ایک میدان میں

مختلف ملکوں سے آنے والے کھیلوں کے وفود کے استقبال کی تیاریوں کا ایک منظر

پہلے ساؤتھ ایشین فیڈریشن گیمز کا انعقاد ستمبر ۱۹۸۴ء میں ہُوا۔ پروگرام کے مطابق ان کھیلوں کو ڈھاکہ میں منعقد ہونا تھا۔ مگر بنگلہ دیش نے ان کے انعقاد سے معذوری ظاہر کردی جس کے بعد یہ کھیل نیپال کے دارالحکومت کٹھمنڈو میں ہوئے۔ ان کھیلوں میں سارک کے ساتوں رکن ممالک نے شرکت کی۔

پہلے سیف گیمز میں ۵ کھیلوں کو شامل کیا گیا تھا جن میں سے تین میں پاکستان نے حصّہ لیا۔ اور پانچ طلائی تین نقرئی اور دو کانسی کے تمغے حاصل کیے۔ بھارت نے سونے کے ۴۴ تمغوں کے ساتھ پہلی پوزیشن حاصل کی۔ سری لنکا دوسرے اور پاکستان تیسرے نمبر پر رہا۔

۱۹۸۵ء میں دوسرے سیف گیمز کی میزبانی ڈھاکہ کے حصّے میں آئی۔ اس بار سات کھیلوں کو ان گیمز میں جگہ دی گئی تھی۔ بھارتی کھلاڑی اس مرتبہ بھی چھائے رہے۔ پاکستان نے ہر کھیل میں کم از کم ایک تمغہ ضرور جیتا۔ سب سے زیادہ ۷ طلائی اور ۴ نقرئی تمغے پاکستان نے باکسنگ میں حاصل کئے۔ اس کے علاوہ ریسلنگ میں بھی پاکستانی پہلوانوں کی کارکردگی اطمینان بخش رہی۔

تیسرے سیف گیمز کا میزبان بھارت کا شہر کلکتہ تھا۔ نومبر ۱۹۸۷ء میں ہونے والے ان کھیلوں کو یادگار گیمز کہا جاسکتا ہے۔ کلکتہ گیمز میں دس کھیل شامل تھے۔ حسبِ معمول بھارتی ایتھلیٹس اور کھلاڑیوں نے اپنے آگے کسی کی نہ چلنے دی اور ۹۱ طلائی ۴۵ نقرئی اور ۱۹ کانسی کے تمغے جیت کر سارک کی سطح پر خود کو برتر تسلیم کروالیا۔

پاکستان کی طرف سے اولمپک میں نام کمانے والے باکسر حسین شاہ جنہوں نے سیف گیمز ۸۴ء میں کھٹمنڈو سے ۸۵ء ۱۹ میں ڈھاکہ اور ۸۷ء میں کلکتہ سے طلائی تمغہ حاصل کر کے پاکستان کا نام روشن کیا۔

پاکستان کی طرف سے سب سے اچھی کارکردگی ایک بار پھر باکسنگ میں دیکھنے میں آئی۔ حسین شاہ نے کھٹمنڈو اور ڈھاکہ کی کارکردگی کو دہراتے ہوئے کلکتہ میں بھی طلائی تمغہ جیتا۔ ٹیبل ٹینس کے انفرادی مقابلوں میں پاکستان کے عارف خان نے بھارت کے نمبر ایک کملیش مہتہ کو ہرا دیا۔ فٹبال میں پاکستانی ٹیم نے ۵۰ ہزار سے زائد شائقین کے سامنے بھارت کی مضبوط ٹیم سے میچ برابر کھیلا۔ تمغوں کی دوڑ میں پاکستان کا نمبر دوسرا رہا، اس نے ۱۶ طلائی ۳۵ نقرئی اور ۱۴ کانسی کے تمغے جیتے۔

اگر تینوں سیف گیمز کی کارکردگی پر نظر ڈالی جائے تو بھارت نے مجموعی طور پر ۳۵۰ تمغے جیتے ہیں پاکستان کے حاصل کردہ تمغوں کی تعداد ۱۱۹ ہے۔ مالدیپ اور بھوٹان دو ایسے ممالک ہیں جو اب تک ایک بھی طلائی تمغہ نہیں جیت سکے ہیں۔

چوتھے ساؤتھ ایشئن فیڈریشن گیمز ۲۰ سے ۲۷ اکتوبر تک ہوں گے۔ اسلام آباد ان گیمز کا مرکز ہے جہاں ایتھلیٹکس، باکسنگ، تیراکی، ٹیبل ٹینس اور ویٹ لفٹنگ کے مقابلے ہوں گے۔ کبڈی اور ریسلنگ کے لئے واہ کینٹ کا انتخاب کیا گیا ہے اور پہلی بار سیف گیمز میں شامل کئے جانے والے اسکواش کے مقابلے پشاور کے جدید سہولتوں سے آراستہ کمپلیکس میں ہوں گے۔ ان کھیلوں کو اعلیٰ پیمانے پر منعقد کرانے اور انہیں یادگار بنانے کے سلسلے میں زبردست تیاریاں کی جاری ہیں۔ جن کا سارا کریڈٹ بری فوج کو جاتا ہے۔

چوتھے سیف گیمز کا افتتاح صدر غلام اسحٰق خان کریں گے اور اختتامی تقریب کی مہمان خصوصی وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو ہوں گی۔ افتتاحی تقریب کے موقع پر اسکولوں کے ہزاروں بچے رنگارنگ پروگرام پیش کریں گے۔ اس کے علاوہ روایتی مشعل بھی روشن کی جائے گی جو مزارِ قائد کراچی سے اپنا سفر شروع کرے گی۔

پاکستان چوتھے ساؤتھ ایشئن فیڈریشن گیمز کی میزبانی کے لیے بالکل تیار ہے۔ یہ کھیل یقیناً اقوامِ عالم میں پاکستان کا وقار بلند کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ سیف گیمز، ہر پاکستانی کے نزدیک "منی اولمپکس" ہیں اور اس کی خواہش ہے کہ آج یہ منی اولمپکس یہاں ہو رہے ہیں تو کل واقعی اولمپکس بھی یہاں ہو جائیں۔

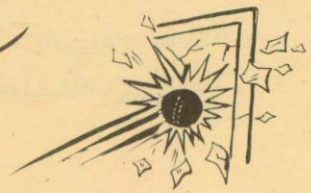

کھیلنا آپ کا حق ہے...

...مگر...

کوئی کھیل اس طرح نہ کھیلئے

جس سے کسی بھی طرح کے نقصان کا اندیشہ ہو

گلی محلّوں کے بجائے کھیل کے لئے میدان کا رُخ کیجیے۔

(اشتہار ادارہ)

خُدا پاکستان کی حفاظت کرے

محمد جاوید خالد

رات سونے سے پہلے ہلکا پھلکا مطالعہ نسیم صاحب کی عادت اور اچھی کتاب ان کی کمزوری تھی۔ اور اس کمزوری کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا کہ ہلکا پھلکا مطالعہ گھنٹوں پر محیط ہو جاتا۔ اس رات میں ایسا ہی ہوا۔ کتاب ایسی اثر انگیز اور معلوماتی تھی کہ انھیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ گھڑیال نے بارہ بجنے کا اعلان کیا تو وہ چونکے اور ایک نظر گھڑی کو دیکھا پھر کتاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ باقی رہنے والے صفحات کا شمار کیا پھر اندازہ لگایا کہ زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر میں کتاب مکمل ہو جائے گی "خیر ہے" وہ بڑبڑائے اس کے ساتھ ہی انھوں نے کتاب پر نظریں گاڑ دیں مگر مطالعے کے اس دوسرے دور کو کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ کال بیل کی تیز آواز نے اُن کی محویت کو ختم کر دیا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے ؟" وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوئے مگر اس کا جواب تو دروازے پر

جاکر ہی مل سکتا تھا۔ سو آہستہ قدموں سے وہ دروازے کی طرف بڑھے۔

"کون ہے بھئی؟" ان کی آواز اُبھری۔

"تمہارا ہم قافیہ" دروازے کے اُس پار سے آواز آئی۔

اس آواز، لہجے اور ان الفاظ کو وہ ہزاروں میں شناخت کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ "ارے فہیم تم!" اس کے ساتھ ہی انھوں نے آنے والے کو زور سے لپٹا لیا۔ اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ "کب آئے؟ سامان کہاں ہے؟ بیوی بچوں کو کیوں نہیں لائے؟"

یار، دروازے پر کھڑے کھڑے ہی سارے سوال کر لوگے یا کچھ اندر کے لئے بھی چھوڑو گے؟" فہیم نے مسکرا کر علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اوہ! اِمعاف کرنا دوست" نسیم صاحب سچ مچ شرمندہ ہو گئے اور پھر دونوں دوست ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندر چلے آئے۔

فہیم صاحب نسیم صاحب کے دیرینہ دوست تھے۔ امریکہ میں ان کا برسوں ساتھ رہا تھا۔ دونوں ایک ہی یونیورسٹی کے طالب علم اور ایک ہی ہوسٹل میں رہائش پذیر تھے۔ فہیم صاحب کی پرانی عادت تھی کہ وہ جب کبھی نسیم صاحب سے ملنے آتے یا ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی تو وہ اپنا تعارف اُسی طرح کراتے "میں ہوں تمہارا ہم قافیہ" کمرے میں آکر قبل اس کے کہ نسیم کچھ کہتے فہیم صاحب بول پڑے "مجھے وضو کروا دو اور جب تک میں نماز پڑھوں میرے کھانے کو جو موجود ہو لے آؤ"

نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر دونوں دوست آمنے سامنے بیٹھے۔ نسیم صاحب کی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے "تمہاری اتنی دیر کی خاموشی کا شکریہ" فہیم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "میں یونیورسٹی کی طرف سے مطالعاتی دورے پر آیا ہوں۔ ایئر پورٹ سے ریسٹ ہاؤس پہنچا اور ساتھیوں کو چھوڑ کر سیدھا تمہارے پاس چلا آیا۔ ہمیں صبح سویرے یہاں سے آگے روانہ ہو جانا ہے۔ بس رات کا یہ آخری پہر ہمارا تمہارا ہے۔ میں نے سوچا جاگو اور جگاؤ"

"تم ہمیشہ سے بے تکا سوچتے آئے ہو" نسیم صاحب نے پیار بھرے غصّے سے کہا "اتنے طویل عرصے بعد ملے ہو اور اس قدر کم وقت کے لیے؟"

فہیم صاحب کیا جواب دیتے ہنس دیئے نسیم صاحب کو ان کی مجبوری کا اندازہ تھا چنانچہ شکوہ شکایت برطرف، دونوں دوست گئے دنوں کو اپنی اپنی یادداشتوں کے حوالے سے کریدنے لگے۔ یونیورسٹی کی شرارتوں سے

چلتی ہوئی بات مُلکی سیاست تک آگئی۔

"کیا حالات ہیں آج کل تمہارے ہاں کی سیاست کے؟" فہیم صاحب نے سوال کیا۔

"تمہارے امریکہ میں ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم کچھ نہیں جانتے" نسیم صاحب مُسکرائے فہیم صاحب بھی جواب میں مُسکرائے پھر کہنے لگے "نسیم! تمہیں یاد ہے جب ہمارا طالب علمی کا دور تھا اور پاکستان کے وزیرِاعظم لیاقت علی خان امریکہ کے دورے پر آئے تھے"

"ہاں! کیوں یاد نہ ہوگا۔ ان دنوں اس بات کے وہاں بڑے چرچے تھے۔ اور پاکستان کے حوالے سے سارے مسلم طلباء بہت پُرجوش تھے۔ ہندو طلباء البتہ طعن گوئی کرتے تھے کہ وہ تو ایک نواب زادے ہیں۔ نازونعم سے پلے ہوئے وہ ایک نمائندہ وزیرِاعظم کیا ہوں گے وغیرہ وغیرہ"

"مگر لیاقت علی خان مرحوم کی سادگی، ایثار اور بے غرضی کی مثالوں نے تو ان کی ساری طعن گوئی پر پانی پھیر دیا اور اس وقت تو ان کو بالکل چُپ لگ گئی۔ جب یہ بات سامنے آئی کہ بھارتی وزیرِاعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے دورۂ امریکہ میں کہا تھا کہ میں حقیقتِ امریکہ جاننے کے لیے یہاں آیا ہوں جبکہ وزیرِاعظم پاکستان نے اس موقع پر کہا کہ میرے امریکہ آنے کی غرض یہ ہے کہ میں امریکی عوام کو حقیقت پاکستان سے آگاہ کروں"۔

"ہاں!! یہ بات سچ بھی ہے کہ اپنے بائیس روزہ قیام میں انھوں نے ہر مقام اور ہر محفل میں امریکہ کو اپنے ملک و قوم سے نہایت خوبی کے ساتھ متعارف کروایا اور پاکستان کی جغرافیائی اہمیت کو نمایاں کیا یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے ہر چھوٹے بڑے اخبار نے اُنہیں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا صفحۂ اوّل پر ان کی خبریں لگاتے ہوئے انھیں "امن کا پیغام برقرار دیا مشہور میگزین ٹائم نے "سلطنت مغلیہ کا" ... زریں ہیرو" کے عنوان سے اعتراف کیا کہ وزیرِاعظم پاکستان دنیا کے دیگر اسلامی ممالک کے قائدین سے زیادہ بااثر اور مضبوط ہیں"۔ "اور پھر تمہیں وہ تقریریں تو یاد ہو گی وہ تاریخی تقریر جو لیاقت علی خان نے امریکی نیشنل پریس کلب میں کی تھی اور جس کو سننے کے لئے ہم جانسن کی رنگارنگ برتھ ڈے تقریب کو چھوڑ کر بھاگے تھے"

"ہاں وہ تقریر واقعتاً تاریخی تھی جس میں سب سے پہلے انھوں نے پاکستان کے پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے صاف صاف کہا تھا۔ کہ دس کروڑ مسلمان برطانیہ کے زیرِ نگیں ہندوستان میں خود کو اقلیت تصوّر کرتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ہندو اکثریت کی محکومی میں ان کی مسلم ثقافت ختم اور ان کی معاشی حالت بدتر ہوتی چلی جائے گی۔ اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے اہم مقاصد میں ہمارے لئے

سب سے پہلے ہمارے ملک کی سالمیت کو یقینی بنانا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا کہ ہمارا ملک بڑی جدّوجہد اور کاوشوں کے بعد وجود میں آیا ہے۔ اس کے حصول کے لئے مسلمانوں کو ایسی قوتوں سے دوچار ہونا پڑا جن کے لئے پاکستان کا تصوّر بے معنی اور ضرر رساں تھا۔ لیکن ہمارے لئے یہ سوال زندگی اور موت کا تھا۔ اتنی تکلیف دہ کوششوں اور جدوجہد کے بعد پاکستانی کسی حالت میں بھی پاکستان کی حدُود میں کسی قسم کی مداخلت یا پاکستان کی حدود کو کہیں سے بھی کم کرنے کی کوشش کو برداشت نہیں کریں گے۔ دوسرا عزیز ترین مقصد انہوں نے اپنی مُسلم ثقافت کی ترقی کو قرار دیا اور تیسرے نصب العین میں ملک کی معاشی ترقی کی خواہش کا اظہار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہمیں جلد از جلد اپنی پس ماندگی کو دُور کرنا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بھارت کے ساتھ تعلقات اور مسئلہ کشمیر کا بھی برملا اظہار کیا۔"

"تمہیں تو تقریر کے نکات بہت اچھی طرح یاد ہیں۔" فہیم صاحب نے نسیم صاحب کے جوشیلے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں یاد نہیں؟" نسیم صاحب نے اُلٹا سوال داغ دیا۔

"میرے دل پر نقش ہیں۔" فہیم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا پھر فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے "ان کی اس تقریر کے آخری الفاظ بہت قیمتی تھے اور وہ ایسے ہیں کہ ہر پاکستانی کو ازبر ہونے چاہئیں انھوں نے کہا تھا کہ آج کی دُنیا میں جب مختلف خیالات و عقائد باہم ٹکرا رہے ہیں، جن قوموں کو آزادی ملی ہے عین ممکن ہے کہ اُن قوموں کو بھی ان مختلف عقائد سے دوچار ہونا پڑے اور وہ بھی تذبذب اور پریشانی میں ایک طویل عرصہ کے لئے مُبتلا ہو جائیں جس کا لازمی نتیجہ ان ملکوں میں سیاسی اور معاشی حالات کی ابتری میں ظاہر ہوگا۔ کیا یہ انتہائی خوشی اور اطمینان کا موقع نہیں کہ ایسی قوموں کے درمیان ایک قوم ایسی بھی ہے جس کے سامنے واضح نصب العین اور روشن منزل موجود ہے جس کے (اسلامی) اصول جمہوریت پسندانہ ہیں جو ہر ایک کی سمجھ میں آسکتے ہیں اور جہاں سماجی اور معاشی انصاف کا دور دورہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے عقائد ہمیں تباہی و بربادی سے بچانے کے سچے محافظ ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ پاکستان وہ مُلک ہے جہاں عوام پوری طرح سے متحد ہیں اور تباہ کُن خیالات اور رجحانات سے کوسوں دور۔ اور آج کی افراتفری کی دُنیا میں کسی مُلک کا اس طرح اپنی زندگی کا آغاز کرنا یقیناً قابلِ تعریف ہے۔۔۔ اچھا مجھے اس بے باک اور مخلص رہنما کی شہادت کی تفصیلات بتاؤ۔ تم تو یہیں تھے میں نے اخبار میں پڑھا تھا مگر نہایت مختصر۔"

"ہاں میرے دوست" نسیم صاحب نے بجھے بجھے لہجے میں کہا "اس کی تفصیلات اتنی ہی ہیں جتنی تم

نے پڑھیں اس سے زیادہ کسی کو خبر نہیں۔ میں یہیں تھا بلکہ جلسہ گاہ میں موجود تھا۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہُوا۔ سپاس نامہ پڑھا گیا اور پھر قائدِ ملّت لیاقت علی خان سے تقریر کے لئے درخواست کی گئی۔ تقریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا مگر کوئی بدنظمی نہ تھی۔ فضا اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد اور قائدِ ملّت زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ خبر یہ تھی کہ قائدِ ملّت جلسہ گاہ میں اہم اعلانات کریں گے۔ نعروں کے شور میں وہ مائک کے سامنے آئے اور ابھی انھوں نے صرف اتنا ہی کہا تھا "برادرانِ ملّت!" کہ یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلنے کی وحشت ناک آواز نے جلسہ گاہ کے سکون کو درہم برہم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہڑبونگ اور افراتفری مچ گئی۔ بڑا قیامت خیز منظر تھا۔ قائدِ ملّت لیاقت علی خان کو لوگوں نے سہارا دیا مگر ان پر کیا گیا وار جان لیوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ لڑکھڑاتی آواز میں انھوں نے کلمہ طیبہ پڑھا اور پھر تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پر جو آخری جملہ آیا وہ یہ تھا کہ "خدا پاکستان کی حفاظت کرے"۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر نسیم صاحب ہی بولے "ان کی شہادت کے بعد ہم میں ایسا قومی انتشار پیدا ہوتا گیا کہ ہم اب تک نہیں سنبھلے، ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی دشمن کی چالیں کامیاب ہوتی گئیں مگر ہم اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ ہم پُرعزم ہیں، ہمیں یقین ہے کہ شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ یہاں ایک دن اسلام کا بول بالا اور محبت کا دور دورہ ہوگا۔ انشاء اللہ"۔ نسیم صاحب کی بات پوری ہوتے ہی فضا مؤذن کی نمازِ فجر کے لئے اذان سے گونج اُٹھی، فہیم صاحب کھڑے ہو گئے۔

"اچھا دوست"۔ انھوں نے کہا "نمازِ فجر مجھے ریسٹ ہاؤس میں پڑھنی ہے تاکہ روانگی میں آسانی رہے"۔ دروازے پر دونوں دوست پھر آمنے سامنے کھڑے تھے۔ پہلے وہ گلے ملے پھر انہوں نے ہاتھ ملائے فہیم صاحب نے نسیم صاحب کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا۔

"روزگار کے چکر نے ہمیں دیارِ غیر میں پھنسایا ہُوا ہے اور نجانے کب تک ایسا ہو لیکن یاد رکھنا کہ وطن سے دُور ہم بسنے والوں کی دھڑکنیں یہیں سے وابستہ ہیں۔ نظریں اسی سمت لگی رہتی ہیں۔ اور ہونٹوں پہ قائدِ ملّت کے وہی الفاظ جو انھوں نے وقتِ شہادت کہے تھے یعنی "خدا پاکستان کی حفاظت کرے"۔ فہیم صاحب نے یہ کہا اور پھر تیز تیز قدموں سے واپسی کے لئے مُڑ گئے۔ نسیم صاحب زیرِ لب بولے "جاؤ خدا تمہارا نگہبان ہو"۔ ساتھ ہی دوسری دُعا بھی اُن کے ہونٹوں پر مچل گئی۔

"خدا پاکستان کی حفاظت کرے"۔ اور اُنھیں یُوں محسوس ہوا جیسے کائنات کی ہر شے اُن کے جواب میں کہہ رہی ہو "آمین"

ابّو کا خطاب (امّی سے)

راجہ مہدی علی خان

خدا کے واسطے کھولو بھی آ کے دروازہ
میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چیخ رہا
اگر علیل نہ ہو آپ کا مزاج شریف
تو پنکھا جھلئے ذرا اُٹھ کے کیجئے تکلیف
یہ چارپائی مری ٹیڑھی کیوں بچھائی ہے؟
بھلا کنّی یہ کیوں فرش پر گرائی ہے ؟
الٰہی کون یہ پانی کا دے گا اتنا بل
خدا کے واسطے کرنل کو بند اے کاہل
چپاتیاں میرے اللہ سب کی سب کچّی
تمام عمر ہی شاید رہو گی تم بچّی
نمک کی کان اُلٹ دی ہے آج سالن میں
اُٹھا پیالہ پٹخ دے یہ جا کے آنگن میں
بس اُٹھ بھی اب کوئی ایسا بُرا تو حال نہیں
یہ مجھ غریب کا گھر ہے یہ ہسپتال نہیں

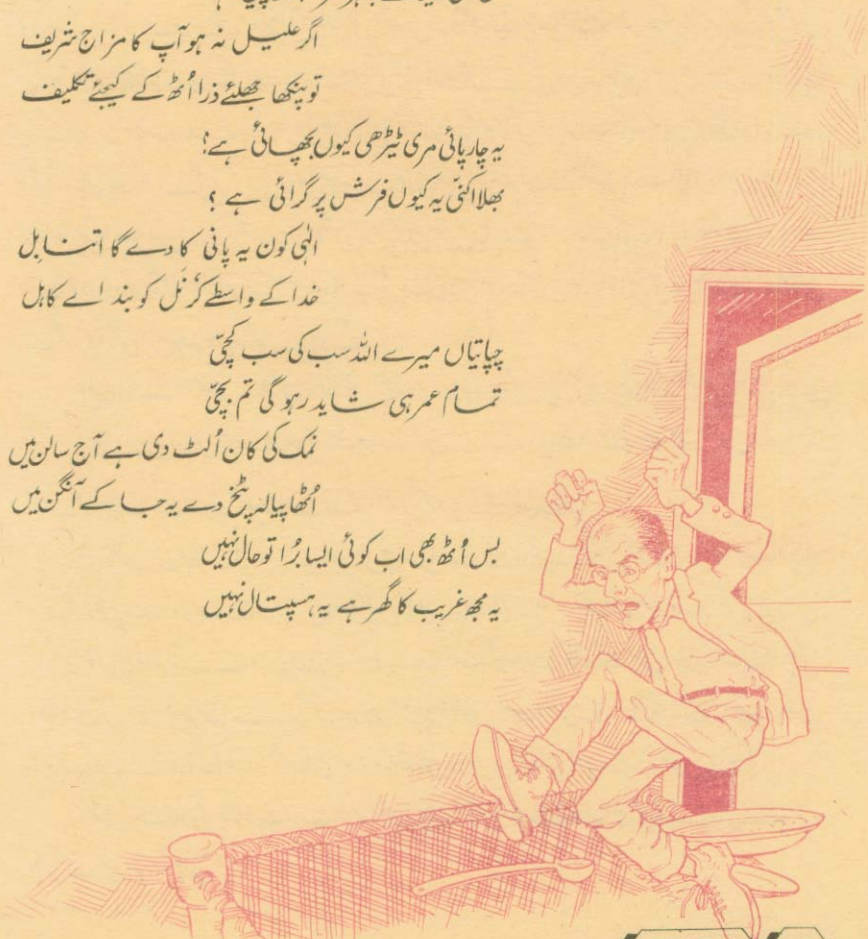

سید خورشید عالم

کینٹکی سے وائٹ ہاؤس تک

امریکہ کے سولہویں صدر کی زندگی کے چند یادگار گوشے

آج میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں گا۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں کون ہوں اور میرا نام کیا ہے؟ لیکن کہانی کے آخر میں آپ سب لوگ میرے نام سے آگاہ ہو جائیں گے۔ میں ۱۲ فروری ۱۸۰۹ء میں امریکی ریاست کینٹکی میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام تھامس تھا۔ جبکہ میری والدہ کا نام نینسی ہینکس تھا۔ ہمارا گھرانہ بڑا غریب تھا۔ اچھے اور بہتر مستقبل کے لیے میرے والد دسمبر ۱۸۱۶ء میں ہم سب لوگوں کو لے کر جنوبی انڈیانا چلے گئے۔ یہاں ہم لوگ لکڑی کے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ میرے والد نے کھیتی باڑی شروع کر دی۔ میں کم عمر ہونے کے باوجود ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔

میری زندگی کا پہلا اور سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ ۱۸۱۸ء میں میری پیاری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میں اور میری بہن سارہ اکیلے رہ گئے۔ اگلے ہی برس میرے والد نے ایک بیوہ خاتون سے شادی کر لی۔ ان کا نام بھی سارہ تھا۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی تھا۔ مجھے شروع شروع میں ان سے بڑا ڈر لگا، مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ہم بہن بھائیوں پر پوری توجہ دی۔ اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہونے دیا کہ ہماری ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں ان سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ آج بھی میں ان کو "فرشتہ ماں" کے لقب سے یاد کرتا ہوں

میرے والد اور میری والدہ گو کہ ان پڑھ تھے مگر ان کو علم کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ میری دوسری ماں نے مجھے پڑھنے پر زور دیا اور ہر ممکن حوصلہ افزائی کی۔ مگر غربت کی وجہ سے میں اسکول کی تعلیم بہت کم حاصل کر سکا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک کتاب کو خریدنے کے لیے میں میلوں پیدل چل کر جاتا تھا۔ میں نے اگرچہ بہت سی کتابیں تو نہیں پڑھیں۔ تاہم جتنی کتابیں میرے محدود وسائل میں دستیاب ہو سکتی تھیں وہ میں نے سب پڑھ ڈالیں۔

مارچ ۱۸۳۰ء میں ہمارا خاندان ہجرت کر کے الینائس آ گیا۔ میری عمر اکیس برس ہو چکی تھی۔ میں قد میں خاصا لمبا ہو گیا تھا۔ چھ فٹ ۴ انچ کا قد مجھے دور سے نمایاں کر دیتا تھا۔ میں نے یہاں چھوٹے موٹے کام شروع کر دیے۔ کبھی والد کے ساتھ کھیتی باڑی میں ان کی مدد کرتا۔ اس کے علاوہ میں نے ایک اسٹور میں ملازمت بھی کی اور سرویئر کا کام بھی کیا۔ الینائس کے ڈاکخانے میں پوسٹ ماسٹر کے فرائض بھی انجام دیئے۔

یہ ان ہی دنوں کا ذکر ہے جب میں ایک دکان پر کام کرتا تھا۔ چینی، نمک، آٹا اور ضرورت کی دوسری اشیا تول کر دینا اور آمدنی کا حساب رکھنا میری ذمے داری میں شامل تھا۔ ایک روز دکان بند کرنے کے بعد جب میں آمدنی کی رقم گن رہا تھا تو کچھ پیسے فاضل نکلے۔ میں حیران تھا کہ آمدنی کے علاوہ یہ رقم کس طرح بچ گئی۔ سوچنے پر مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک غریب گاہک خاتون کو پیسے واپس کرنے میں غلطی کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اس رقم کو اپنی جیب میں ڈال لوں۔ کیونکہ میری تنخواہ بھی انتہائی کم ہے مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے اس خیال کو جھٹک دیا۔ میں نے دکان بند کی اور سخت سردی میں اس عورت کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ عورت مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جب میں نے اُسے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ مزید حیران ہوئی۔ پھر بولی۔

"اگر تم اسی طرح دیانت داری اور محنت سے کام کرتے رہے تو ایک دن ضرور نام پیدا کر لو گے"۔ میں مستقبل کے سہانے خواب آنکھوں میں سجائے واپس چلا آیا۔

۱۸۳۶ء میں میں نے قانون کا امتحان پاس کر لیا اور وکالت شروع کر دی۔ اگلے سال میں اسپرنگ فیلڈ منتقل ہو گیا۔ جہاں جان ٹی اسٹوارٹ اور اسٹیفن ٹی لوگن نام کے دو وکیلوں کے ساتھ کام کیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۴ء میں ولیم ایچ ہرنڈن نام کے ایک اور وکیل کے ساتھ پارٹنر شپ میں وکالت شروع کی۔ ہماری پارٹنر شپ نہایت کامیاب رہی۔ اگلے چند برسوں میں میری آمدنی بارہ سے پندرہ سو ڈالر سالانہ تک پہنچ چکی تھی۔ اس زمانے

میں اتنی آمدنی بہت ہوتی تھی۔ کیونکہ کسی امریکی ریاست کے گورنر کو بارہ سو ڈالر سالانہ اور کسی بھی سرکٹ جج کو ساڑھے سات سو ڈالر سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ میں نے مختلف مقدمات کی پیروی کے لیے آس پاس کے علاقے کا سینکڑوں میل کا سفر بھی کیا۔ میں کبھی گھوڑے پر اور کبھی بگھی میں بیٹھتا اور دُور دراز کے سفر پر نکل جاتا۔ ۱۸۵۰ء میں ریل کی سہولت نے میرے کام کو مزید آسان کر دیا۔ مختلف مقدمات کے سلسلے میں کامیابی میرے قدم چومتی رہی۔

میری شادی ۴ر نومبر ۱۸۴۲ء میں میری ٹوڈ سے ہوئی۔ میری بیوی تعلیم یافتہ اور ذہین خاتون تھی۔ میرے چار بیٹے تھے۔ رابرٹ ٹوڈ، ایڈورڈ بیکر جو چار برس کی عمر میں فوت ہو گیا۔ ولیم ویلس بھی گیارہ برس کی عمر میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ چھوٹا بیٹا تھامس جسے ہم لوگ ٹیڈ کہتے تھے۔ مجھے نہایت پیارا تھا۔ میں پوری کوشش کرتا تھا کہ اپنے گھر اور بیوی بچوں پر بھرپور توجہ دوں مگر اپنی مصروفیات کی وجہ سے میں اکثر گھر سے باہر وقت گزارنے پر مجبور رہتا۔ اس زمانے میں امریکہ میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ چنانچہ میری بیوی عدم تحفظ کے احساس اور پریشانیوں کی وجہ سے نڈھال اور بیمار ہوتی گئی۔ میری زندگی کا دوسرا افسوس ناک واقعہ یہ تھا کہ میری عزیز بیوی کو ۱۸۷۵ء میں باضابطہ طور پر پاگل قرار دے دیا گیا۔

مجھے سیاست سے شروع ہی سے لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے ۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۰ء تک میں چار مرتبہ الینائس کی مجلس قانون ساز کا رکن منتخب ہوا۔ میں ۱۸۴۷ء سے ۱۸۴۹ء تک کانگریس کا رکن بھی رہا۔ ۱۸۵۶ء میں میں نے ری پبلکن پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۱۸۶۱ء میں مجھے امریکہ کا سولہواں صدر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں نے اپنی صدارت کے دوران، امریکہ سے غلامی کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ اس زمانے میں نیگرو افراد کو غلام بنا کر رکھنے اور ان سے کام لینے کا رواج پورے امریکہ میں عام تھا۔ مجھے غلاموں سے ہمدردی اور غلامی سے نفرت تھی۔ ایک بار دریائے اوہایو میں ایک کشتی کے سفر میں میں نے تقریباً درجن بھر غلام دیکھے جو آہنی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ یہ منظر میرے لیے ایک مسلسل اذیت سے کم نہ تھا۔ میں نے یہ منظر ہر جگہ دیکھا۔

۱۴ر اپریل ۱۸۶۵ء کی شام کو میں اپنی بیوی کے ساتھ فورڈ تھیٹر میں تماشا دیکھ رہا تھا کہ جان ولکس بُوتھ نامی ایک شخص نے مجھے گولی مار دی۔

اس موت پر پورا ملک غم واندوہ میں ڈوب گیا۔ ایک تبصرہ یہ بھی کیا گیا جو تاریخ کا حصہ بن چکا ہے کہ "مسیح نے بنی نوع انسان کے لیے جان دی۔ جبکہ لنکن نے اپنے ملک کی خاطر اپنی جان قربان کر دی"

جی ہاں! مرنے والے اس شخص کا نام ابراہام لنکن تھا۔ امریکہ کا سولہواں صدر!!

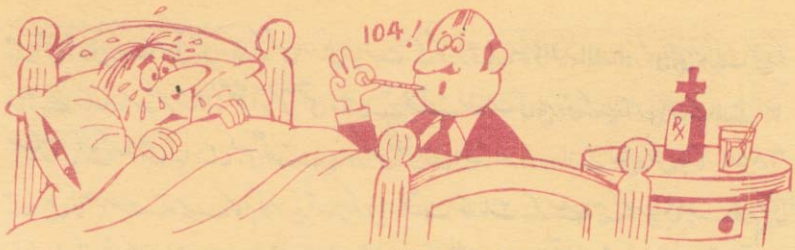

کیا آپ صحت مند ہیں

ساجد سعید

کیا آپ صحت مند ہیں؟ اگر ہیں تو یقیناً آپ کی صحت قابلِ دید ہوگی۔ سلجھے ہوئے بال۔ موتی کی طرح چمکتے ہوئے دانت۔ سڈول جسم اور فکروں غموں سے آزاد آپ کا دماغ۔ آپ میں اکثر ایسے بھی ساتھی ہوں گے۔ جو کہیں گے کہ ہماری صحت تو ایسی نہیں تو ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ وہ کون سے عوامل ہیں جن پر عمل کر کے آپ اپنی صحت کو پُرکشش بنا سکتے ہیں۔

انسان کا جسم اُس مشین کی مانند ہے جس کے پُرزوں کی اگر حفاظت نہ کی جائے تو وہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر اُن کی صحیح طریقے سے دیکھ بھال کی جائے تو وہ اپنا کام بہتر طور پر کرتے ہیں۔ مشین کے ایک پُرزے کی خرابی پوری مشین کو متاثر کرتی ہے۔ اسی طرح اگر آپ کے جسم کا کوئی حصّہ صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تو پورا جسم اس کی وجہ سے متاثر ہوتا ہے۔

خدا اُن لوگوں سے زیادہ محبت کرتا ہے جو پاکیزگی اور طہارت کو اپنا شعار بناتے ہیں۔ جسمانی پاکیزگی یہ ہے کہ انسان ظاہری ناپاکیوں سے دُور رہے اور روحانی پاکیزگی یہ ہے کہ آپ کا باطن وسوسوں اور گندے خیالات کا مسکن نہ بنے۔ صفائی میں ذاتی صفائی بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے دانت پیلے ہیں یا مسوڑوں سے خون آتا ہے تو سب سے پہلے آپ کسی اچھے دانتوں کے ڈاکٹر سے چیک اپ کروائیے۔ دانتوں کی صفائی اور حفاظت سے ہاضمے پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور انسان ہشاش بشاش رہتا ہے۔ مسواک کی عادت ڈالیے کیونکہ یہ نہ صرف سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے بلکہ سائنسی تحقیقات کے لحاظ سے بہت مفید بھی۔ دانت نہ صاف کرنے سے انسان طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حضورؐ کا معمول تھا کہ جب نیند سے بیدار ہوتے

تو مسواک سے اپنے دانت صاف کرتے اس کے علاوہ صبح نہار منہ ہلکی پھلکی ورزش بھی صحت پر بہت اچھا اثر ڈالتی ہے۔ روزانہ اپنی جسمانی قوت کے لحاظ سے ورزش کرنے سے خون میں روانی رہتی ہے اور اس کی وجہ سے دل و دماغ تر و تازہ رہتے ہیں۔ اگر آپ جسمانی لحاظ سے فٹ ہیں تو آپ اپنے اسکول و کالج کا کام بھی بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ آپ نے بارہا محسوس کیا ہوگا کہ کبھی کبھی انسان کے جسم سے خاص قسم کی بُو آتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کے جسم میں لاکھوں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں۔ جن کو مسام کہتے ہیں۔ ان مساموں سے جو پسینہ نکلتا ہے اُس میں ردّی چیزوں اور جلد کے مردہ ذرّوں کی وجہ سے آدمی کے جسم اور کپڑوں سے بدبُو آتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے انسان کو چاہیے کہ وہ روزانہ موسم کے مطابق ٹھنڈے یا گرم پانی سے کسی اچھے صابن سے نہائے۔ نہانے کے بعد آپ کو چاہیے کہ تولیے کو دھوپ میں ٹانگ دیں تاکہ تولیے میں بدبو نہ پیدا ہو۔

بال بھی انسان کی ظاہری خوبصورتی کو قائم رکھنے کے لئے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کھُدرے اور اُلجھے ہوئے بال آپ کے چہرے کو عجیب بنا دیتے ہیں۔ آپ اپنے بالوں کو گرد و غبار سے بچائیے۔ ہفتے میں ایک دفعہ زیتون یا سرسوں کے تیل کا مساج کیجیے۔ روزانہ ورزش کرتے وقت تھوڑی دیر اُلٹے کھڑے ہو جائیے تاکہ بالوں کی جڑوں میں خون کی روانی تیز رہے۔ کھانا ہمیشہ وقت پر اور اعتدال میں رہتے ہوئے کھائیے۔ پُرخوری اور منہ کو ہر وقت چلانے کی عادت سے بچئے۔ کھانا اُس وقت تناول کیجیے جب آپ کو بھوک لگے۔ آپ نے وہ حدیث ضرور سنی ہوگی کہ جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ "مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے ..."

صحت کا دارومدار معدے کی تندرستی پر ہے زیادہ کھانے سے معدے اور ہاضمے پر بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بازاروں میں کھُلی ہوئی مٹھائیاں، چھولے اور پھل بکتے ہیں، جن پر سینکڑوں کی تعداد میں مکھیاں بیٹھتی ہیں۔ یہ مکھیاں پیشاب، بلغم، لید، گوبر جیسی گندی چیزوں میں بیٹھتی ہیں۔ وہاں سے اُڑ کر وہ ان کھانے کی کھُلی اشیاء پر بیٹھ جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے جسم اور ٹانگوں سے چمٹے لاکھوں کروڑوں جراثیم ان اشیاء میں منتقل ہو جاتے ہیں اور جس کی وجہ سے بے شمار بیماریاں جن میں پیٹ کا درد، کھانسی، نزلہ، زکام وغیرہ جیسی خطرناک بیماریاں پروان چڑھتی ہیں۔ لہٰذا آپ ساتھیوں کو چاہیے کہ ایسی جگہوں سے چیزیں خریدیں جہاں صفائی کا خیال رکھا گیا ہو۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ اور رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے کو اپنی عادت بنا لیجیے۔

خوش رہیے۔ ذہن کو پریشانیوں اور تفکرات سے دُور رکھیے۔ موجودہ دور لاتعداد مسائل کا دور ہے اس پُرکشش دور میں پریشانیوں نے انسان کا احاطہ کیا ہُوا ہے۔ ذہن کو گندے اور بُرے خیالات سے دُور

رکھیے اگر آپ فارغ ہیں تو کسی اچھے سے مشغلہ کو اپنا معمول بنا لیجیے مثلاً چھوٹے موٹے سائنسی تجربات، کمپیوٹر کا سیکھنا، یا ٹکٹوں کا جمع کرنا، تیراکی، باغبانی یا مختلف کتب کا مطالعہ یہ ایسے مشاغل ہیں جو آپ کو موجودہ زمانے سے باخبر رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور دماغ صحت مند رہتا ہے۔

انسانی صحت کو برقرار رکھنے میں نیند کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اگر آپ کی نیند پُرسکون ہے اور بے خوابی آپ کے قریب بھی نہیں بھٹکتی تو یقیناً آپ ایک صحت مند انسان ہیں۔ نیند سے آپ کے جسم کو آرام اور اعضا کو تازگی ملتی ہے۔

لباس کو بھی صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ میلا اور گندا لباس بیماری کا گھر ہوتا ہے۔ لباس ہمیشہ موسم کے مطابق ہونا چاہیے۔ سوتی، ریشمی یا اونی کپڑے اپنی مالی حیثیت کے مطابق پہنیے۔ بعض لوگوں کو نائلون کا کپڑا راس نہیں آتا۔ اس کو پہنتے ہی اُن کے جسم پر خارش ہونے لگتی ہے یا باریک باریک دانے نکل آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نائلون وغیرہ کا لباس نہیں پہننا چاہیے۔

ہمیشہ جفاکشی، محنت اور بہادری سے زندگی گزاریئے۔ کاہل، سُست عیش پرست نہ بنیے۔ اپنا کام دوسروں پر نہ چھوڑیئے۔ ایک دفعہ آپؐ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ "معاذ اپنے آپ کو عیش کوشی سے بچائے رکھنا (مشکوٰۃ)

نماز کو اپنی عادت بنا لیجئے۔ غصہ، نفرت، غرور، غیبت اور ظلم جیسی اخلاقی برائیوں سے بچئے۔ ان بیماریوں سے ذہنی ٹینشن Tension اور ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور نتیجتاً اعصابی تناؤ Nervous Tension جس میں دماغی رگیں سکڑ جاتی ہیں اور خون کی Circulation آہستہ ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دماغ کی رگوں کو بروقت خون میسر نہیں ہوتا اور انسان بالآخر نفسیاتی اُلجھنوں میں گھر جاتا ہے اور اپنا کام صحیح طور پر کر نہیں پاتا۔ اس کے دوسری طرف پیار و محبت، نرم لہجہ۔ رحم جیسی اخلاقی اچھائیوں سے اس کے برعکس نتائج نکلتے ہیں۔ پان، سیگریٹ اور نشہ آور چیزوں سے پرہیز کیجئے۔ یہ نہ صرف دماغ کو متاثر کرتی ہیں بلکہ معدے پر بھی ان چیزوں کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ ایسی غذاؤں کو اپنائیے جو نہ صرف زود ہضم ہوں بلکہ تازہ بھی، مثلاً تازہ پھل، ہری سبزیاں گوشت وغیرہ آپ جلد صحتیاب ہو جائیں گے

الغرض آپ کی زندگی دوسروں کے لئے مثالی ہونی چاہیئے۔ تہذیب و شائستگی اور اخلاقیات سے واقفیت منفی Negative خیالات سے اجتناب اور صحت کے ذریں اصولوں کو اپنانے سے ہی آپ ایک کامیاب اور بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔

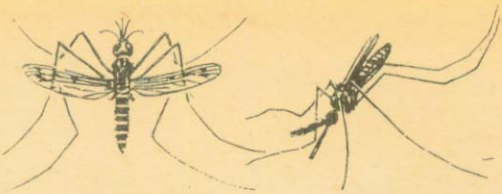

نسیر ابدالی

نیندیں اُڑا دینے والے
مختصر ترین دشمن کی
شر انگیزیوں کا احوال

بُھن بُھن چرائی مہالتا

مضمون کا عجیب و غریب سا عنوان دیکھ کر آپ تو حیران ہو گئے۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ بھئی بات یہ ہے کہ ہندی میں مچھر کو "بھن بھن چرائی مہالتا" کہتے ہیں اور آج ہم آپ کو اسی مچھر کے بارے میں کچھ دلچسپ معلومات فراہم کر رہے ہیں۔

رات کے وقت جب آپ سونے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تو عین اُسی وقت چند "بمبار" مچھر بھنبھناتے ہوئے آپ کے کان کے پاس چکر لگانے لگتے ہیں۔ آپ بے چینی سے ہاتھ ہلا ہلا کر ان کو اپنے آپ سے دُور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ وہ آپ کو کاٹنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوں۔ آج ہم آپ کو انہی مچھروں کے بارے میں چند سوالات اور ان کے جوابات پیش کر رہے ہیں۔ شاید اسے پڑھنے کے بعد آپ خود کو مچھروں سے محفوظ رکھ سکیں۔

سوال :۔ مچھر ہمیں کیوں کاٹتے ہیں ؟

جواب :۔ پہلی بات تو یہ کہ سارے مچھر نہیں کاٹتے۔ کاٹنے کا یہ "فرض" صرف مادہ مچھر ہی انجام دیتی ہے۔ نر مچھر کاٹنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ ماہرینِ علم الحشرات کا کہنا ہے کہ مادہ مچھروں کو انسانی یا حیوانی خون کی ضرورت "لازمی وٹامن" کے طور پر ہوتی ہے۔ اور اگر وہ اپنی یہ ضرورت پوری نہ کریں تو ان کی نسل کمزور ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گی۔

سوال :۔ مچھر انسانوں کو کس طرح تلاش کر لیتے ہیں ؟

جواب :۔ دوسرے کیڑے مکوڑوں کی طرح اُن میں بھی سُونگھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ انسانی جسم سے اُٹھنے والی مہک کو مچھروں میں موجود "کیموری سیپٹرز" Chemoreceptors کسی راڈار کی طرح محسوس کر لیتے ہیں۔ چنانچہ "آدم بُو" محسوس کرتے ہی وہ فوراً حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

سوال :۔ مچھر ہم انسانوں کو کاٹنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کتنا فاصلہ طے کر سکتے ہیں ؟

جواب :۔ آپ شاید یقین نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ مچھر انسانوں تک پہنچنے کے لیے اپنی کمین گاہ سے ایک ہزار فٹ دُور تک کا سفر طے کر سکتے ہیں۔

مچھروں کی ایک قسم تو ایسی بھی ہے جو پچاس سے ستر میل دُور کا فاصلہ طے کر کے بھی انسانوں کی بستیوں پر حملہ آور ہو جاتی ہے۔ مچھر عام طور پر جھاڑیوں، کیچڑ یا دلدلی زمینوں، جو ہڑوں اور کوڑے کے ڈھیر پر اپنا بسیرا کرتے ہیں۔ ان کے "فضائی حملے" سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ اپنے اطراف کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کریں۔

سوال :۔ مادہ مچھر انسان کی کھال میں کس طرح اپنا ڈنک ڈال دیتی ہے؟ جب کہ انسانی کھال موٹی ہوتی ہے؟

جواب :۔ مادہ مچھر کے پاس اعلیٰ کارکردگی کا حامل ایک قسم کا ڈرل ہوتا ہے جس کو انسانی کھال میں چاہے وہ کتنی ہی موٹی کیوں نہ ہو پیوست کر سکتی ہے۔ آپ یہ جان کر انتہائی حیران ہوں گے کہ مینڈک اور سانپ کی کھال بھی بڑی آسانی سے مادہ مچھر کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس سے مادہ مچھر کے ڈنک کی مضبوطی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مادہ مچھر اپنے شکار میں جب اپنا ڈنک پیوست کرتی ہے تو صرف چند لمحوں میں وہ خون کی مخصوص مقدار اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

سوال :۔ ہمارے ہاتھ ہلانے یا مارنے سے قبل مچھر کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوتے ہیں؟

جواب :۔ دراصل ہماری کھال کا اچانک تناؤ مچھر کے لیے خطرے کی گھنٹی کا کام دیتا ہے۔ اس طرح مچھر کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا شکار جوابی کارروائی کرنے والا ہے۔ چنانچہ وہ فوراً اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے۔ اونٹاریو یونیورسٹی کے ڈاکٹر ڈبلیو اے براؤن نے ایک تجربے سے ثابت کیا کہ مچھر ہمارے جسم سے خارج ہونے والے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کی وجہ سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص بالکل ساکت ہو کر سانس روکے لیٹا رہے تو مچھر ایسے شخص کو بالکل نہیں کاٹتے۔ بلکہ وہ ہماری سانس کی رفتار سے ہماری طرف اپنی توجہ کر لیتے ہیں۔

سوال :۔ کیا لباس کا رنگ بھی مچھروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے؟

جواب :۔ جی ہاں۔ ڈاکٹر براؤن کا کہنا ہے کہ دس میں سے ۹ مچھر گہرے رنگ کے لباس کی وجہ سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ جبکہ صرف ایک مچھر ہلکے رنگ کے کپڑے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہلکا رنگ آپ کو مچھروں کی "جارحیت" سے محفوظ رکھنے میں نہایت معاون ثابت ہوگا۔

سوال :۔ مچھروں کی زندگی کتنی ہوتی ہے ؟

جواب :۔ بیچارے مچھر نہایت ہی مختصر مدت کے لیے دنیا میں آتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ نر مچھر کی زندگی صرف آٹھ یا نو دن پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مادہ مچھر قدرے خوش قسمت ہوتی ہے۔ یہ تیس دن تک زندہ رہنے کے بعد عدم آباد کا رُخ کرتی ہے۔ اگر موسمِ سرما شروع ہو جائے اور مادہ مچھر نے انڈے دے دیئے ہوں تو وہ پورا موسمِ سرما "ہائی برنیشن" میں گزار دیتی ہے۔ اس طرح کی صورتِ حال کی وجہ سے اس کی زندگی چار یا پانچ مہینوں پر مشتمل ہو جاتی ہے۔ ورنہ مادہ مچھر کی اوسط عمر ایک ماہ ہی ہوتی ہے۔ عام طور پر موسمِ گرما میں دس دنوں میں انڈوں سے مکمل بچہ تیار ہو جاتا ہے۔

سوال :۔ کیا سارے مچھر جراثیم کو پھیلانے کا سبب بنتے ہیں ؟

جواب :۔ جی نہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ مچھروں کی ڈھائی ہزار اقسام ہوتی ہیں۔ اُن میں سے بہت کم مچھر جراثیم کو پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ مچھر ہی وہ واحد کیڑا ہے جو کسی بھی طرح کے جراثیم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔ سر پیٹرک مینسن Sir Patrick Manson نے ۱۸۷۸ء میں چین میں دریافت کیا کہ جس بیماری سے پاؤں اور خُدود سوج جاتے ہیں اُسے بھی مچھر ہی پھیلاتے ہیں۔ اس بیماری کو "فلیریا" Filariasis کہتے ہیں۔ اس میں انسانی پاؤں ہاتھی کے پیروں کی مانند پھُول جاتے ہیں۔ اسی لیے اس بیماری کو "فیل پا" بھی کہتے ہیں۔

۱۸۹۷ء تک ایک مادہ مچھر "اینو فلیز" Anopheles کے متعلق معلوم ہو گیا وہ ملیریا پھیلانے کا سبب بنتی ہے۔ کسی زمانے میں قبرص کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ دنیا بھر میں ملیریا کا سب سے بڑا گڑھ ہے مگر اب یہ ملک ملیریا سے مکمل طور پر محفوظ ہو چکا ہے۔

ابھی کراچی میں بارش ختم ہوئے چند روز ہی ہوئے ہیں۔ عام طور پر موسمِ برسات کے بعد جب جگہ جگہ پانی کھڑا ہو جاتا ہے تو ملیریا کے امکانات بھی اسی طرح بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے اگر کسی جوہڑ میں پانی جمع ہو جائے تو اُس میں تھوڑا سا چونا یا مٹی کا تیل ضرور ڈال دیں۔ ورنہ یہاں مچھروں کا "ہیڈ کوارٹر" قائم ہونے کے بعد علاقے میں ملیریا کی وبا پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ گندگی جتنی کم ہو گی مچھروں کا بسیرا اتنا ہی کم ہو گا۔ اس لیے کہ یہ گندگی ہی مچھروں کی اصل "رہائشی کالونیاں" ہوتی ہیں۔ اگر مچھروں سے اور بیماریوں سے محفوظ رہنا ہے تو گندگی کو آج ہی ختم کر ڈالیے۔

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی	فون:- ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا	فون:- ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور	فون:- ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور	فون:- ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی	فون:- ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم	فون:- ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد	فون:- ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان	فون:- ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور	فون:- ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار، وہاڑی	
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان	فون:- ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ	
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد	فون:- ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ	
ایم ایم ٹریڈرز۔ کوئٹہ	فون:- ۷۵۰۰۲	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر	
ملک اینڈ سنز۔ سیالکوٹ	فون:- ۸۷۹۸۹	سلمان برادرز۔ نواب شاہ	فون:- ۲۴۱۴
		سعید بک اسٹال۔ گجرات	فون:- ۰۴۳۳۱

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، فورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

جُستجو شرط ہے

اسامہ بن سلیم

ذہانت و معلومات کا منفرد ماہانہ مقابلہ

"جستجو شرط ہے" حاضر ہے... قلم کاغذ لے کر تیار ہو جایئے... ہر سوال میں دیئے گئے ناموں میں سے ایک ایک حرف چُنیں اور مطلوبہ جواب بنالیں۔ شعر کا مصرعہ جواب تک پہنچنے میں آپ کی مدد کرے گا۔ اس مقابلے میں شرکت کا طریقہ تفصیلاً اتنی بار بتایا جا چکا ہے کہ اب مزید تفصیل سے کچھ بتانا مناسب نہیں لگتا۔

اس ماہ سے خیال رہے کہ جواب بھجوانے کے لئے آپ کو لمبی مہلت نہیں دی جا رہی۔ ۱۰ اکتوبر سے قبل آپ کے جواب لازماً موصول ہو جانے چاہئیں۔

درست جواب بھجوانے والے ساتھیوں میں سے تین کو بذریعہ قرعہ اندازی کُتب کا انعام بھجوایا جائے گا۔ ستمبر کے مقابلے میں درست جوابات کے ساتھ شریک ہونے والے اب تک کے ساتھیوں کے نام اس ماہ شائع کئے جا رہے ہیں۔

لیجئے اب سوالات کو بغور پڑھیئے اور جواب تحریر کیجئے۔

سوالات

۱۔ ہم نے آپ سے ایک گیس کا نام پوچھا ہے۔ گیس کے دوسرے بہت سے ناموں میں پوشیدہ یہ۔ کونسی گیس ہے...؟ غور کیجئے۔

(۱) آکسیجن (۲) ہیلیم گیس (۳) ہائیڈروکلورک (۴) ہائیڈروکاربون (۵) نائٹروجن (۶) ہائیڈروجن

اشارہ:۔ اک طرح کے بخار سے ملتا ہے میرا نام

۲۔ معروف بین الاقوامی تنظیموں کے طویل نام مختصر اور مخفف ہو کر اپنے اصل ناموں سے زیادہ مشہور ہو گئے ہیں۔ ایسی ہی چند عالمی تنظیموں کے ناموں کو بغور پڑھئے اور پھر ایک ایسی ہی عالمی تنظیم کا نام بتائیں۔

(۱) آسیان (۲) ناٹو (۳) ایمنسٹی انٹرنیشنل (۴) اوپیک

اشارہ:۔ تین نقطے لگاؤ مجھ پر تم مجھ کو پاؤ گے بحر و قلزم میں

۳۔ جیومیٹری کے مختلف زاویوں اور شکلوں میں ایک مخصوص شکل اس کا جیومیٹریکل نام اُردو میں بتانا ہے۔

(۱) مستطیل (۲) مسبع (۳) مکعب (۴) ذوار بعۃ الاضلاع (۵) مخمس

اشارہ معقول تو نہیں ہے کڑے کوس کا سفر

۴۔ سفر کے مختلف ذرائع میں ایک معدوم ہوتے ہوئے ذریعہ کا نام آپ کو تلاش کرنا ہے۔

(۱) موٹر سائیکل (۲) ریل گاڑی (۳) طیارہ (۴) موٹر کار

اشارہ:۔ ٹ سے ٹوپی اوڑھ کے لالہ رام رام کیوں کرتے ہو

۵۔ اُردو کے مشہور شعرا میں سے ایک شاعر۔ نام تلاش کیجئے۔

(۱) نادر کاکوروی (۲) میر انیس (۳) اصغر گونڈوی

دامن پہ لگ گیا تو بُرا ہوگا سوچ لو

۶۔ بین الاقوامی شہرت کی حامل ایسی شخصیات جن کی موت، قتل کا نتیجہ تھی۔ مقتولین میں ایک مقتول کا نام تلاش کیجئے۔

(۱) لیاقت علی خان (۲) گاندھی (۳) کینیڈی (۴) اندرا

اشارہ:۔ جمہوریت کا نام پڑا تیرے کام سے

۷۔ پاکستان کی مختلف کمشنریوں میں ایک کمشنری کا نام پوشیدہ ہے۔ یہ نام کس کمشنری کا ہے۔

عقل کے گھوڑے ملک بھر میں دوڑ ائیے۔

(۱) مالاکنڈ (۲) کوئٹہ (۳) سرگودھا (۴) گجرانوالہ (۵) ڈیرہ اسماعیل خان

اشارہ:۔ سنگلاخ چٹانوں میں ڈھونڈو اور ڈھونڈو ساحل ساحل یہ

۸۔ مشہور خفیہ اداروں اور سراغرسانی کی ایجنسیوں میں ایک ایسے دہشت گرد کا نام تلاش کیجیے جو ان میں سے بیشتر کے لئے دردِ سر بن چکا ہے۔

(۱) کے جی بی (روس) (۲) خاد (افغانستان) (۳) را (بھارت) (۴) بلیک ستمبر (۵) موساد (اسرائیل) (۶) سی آئی اے (امریکہ)

اشارہ:۔ ٹی وی پہ آج کل تو فقط جانگلوس ہے۔

۹۔ روس کے مشہور بڑے شہروں میں ایک مشہور شہر کا نام تلاش کیجئے۔

(۱) ووستوک (۲) مرمانسک (۳) دونگوگراڈ (۴) تاشقند (۵) لینن گراڈ (۶) دلاوی

اشارہ:۔ ثمر بل جائے گا تم کو اگر قندھار کو آؤ

۱۰۔ مشہور بُرج stars میں سے ایک کا نام معلوم کرنا ہے غور کیجیے

(۱) جوزہ (۲) اسد (۳) مشتری

اشارہ ۔ بات اپنی کرو تو جانیں ہم ۔ جدو امجد کی بات کرتے ہو

ماہ ستمبر کے درست جوابات

۱ ۔ الرحمٰن
۲ ۔ مادام کیوری
۳ ۔ گُل جی
۴ ۔ ہومر
۵ ۔ فرانسیسی
۶ ۔ میٹرو
۷ ۔ کولڈ ڈایمنڈ
۸ ۔ ماسکو
۹ ۔ کیروسین
۱۰ ۔ ہارورڈ

انعام حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی

(۱) عظمیٰ ادریس ۔ رامسوامی، کراچی ۔ (۲) محمد فیصل ۔ منڈوالایار (۳) تابندہ ریاض ۔ باغبانپورہ، لاہور

درست جوابات ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

۱۔ عمران مبارک، نارتھ ناظم آباد کراچی
۲ ۔ خالد رفیق، دستگیر سوسائٹی کراچی
۲ ۔ سیدہ عائشہ شبلی، نارتھ ناظم آباد کراچی
۴ ۔ نازش گلزار علی، گارڈن ویسٹ کراچی
۵ ۔ سید محمد عامر رفیع، ملیر ہالٹ کراچی
۶ ۔ شاہد محمود بدر، فیڈرل بی ایریا کراچی
۷ ۔ عطیۃ العلیم ذکیہ، فیڈرل بی ایریا کراچی
۸ ۔ عدنان فاروقی، فیڈرل بی ایریا کراچی
۹ ۔ شارق شمیم، آگرہ تاج کالونی کراچی
۱۰ ۔ عبدالباسط، نارتھ کراچی
۱۱ ۔ سرفراز عباس، کھوکھرا پار کراچی
۱۲ ۔ عادل علی محبوب، نیو کراچی
۱۳ ۔ غلام حسین میمن، کھائی روڈ حیدر آباد
۱۴ ۔ آصف کریم، شاہی بازار حیدر آباد
۱۵ ۔ غلام مرتضیٰ، سنجھورو سانگھڑ
۱۶ ۔ ذوالفقار حیدر، سنجھورو سانگھڑ

۱۷۔ حمیرا اقبال، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۱۸۔ رابعہ علی، ٹاؤن شپ لاہور

۱۹۔ آصف وقار آصف، لالہ رخ واہ کینٹ

اس کوپن کے بغیر جستجو شرط ۸ کے مقابلے میں شرکت ممکن نہیں

نام ۔۔۔۔۔ کلاس ۔۔۔۔۔ عمر ۔۔۔۔۔

پتہ ۔۔۔۔۔

حاصل کردہ پوائنٹس ۔۔۔۔۔

احتیاط کیجئے

گلی محلّوں اور گھر کی چھتوں پر پتنگ اُڑانا خطرناک ہے

پتنگ اُڑانے اور پتنگ لوٹنے کا شوق، کسی بڑے حادثے کا باعث بھی ہو سکتا ہے

اشتہار ادارہ

چُنی معلومات

عقیل عباس جعفری

اعداد ہماری زندگی کا جُزوِ لازم ہیں... ظاہری واقعات ہوں یا باطنی معاملات' یہ سب کسی نہ کسی طرح اعداد اور ہندسوں سے جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اعداد سے ہماری زندگی کے اس گہرے تعلّق کی اہمیّت کے پیشِ نظر ہمارے محقق ساتھی عقیل عباس جعفری نے بڑی محنت اور جانفشانی سے معلومات کا یہ انوکھا سلسلہ شروع کیا ہے جو اعداد کے گرد گھومتا ہے۔ صفر سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ دیکھیں کہاں جاکر ختم ہوتا ہے... اس مفید سلسلے کو پڑھیے اور اعداد کے حوالے سے اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے (ادارہ)

(۷۶)

- قرآنِ پاک کی آخری ۷۶ سورتیں مفصّل کہلاتی ہیں۔
- حسرت موہانی کا انتقال ۷۶ برس کی عمر میں ہوا تھا۔
- ٹیبل ٹینس کی میز زمین سے ۷۶ سینٹی میٹر اونچی ہوتی ہے۔
- سنگاپور کی آبادی تقریباً ۲۵ لاکھ ہے۔ جس میں سے ۷۶ فی صد آبادی چینی زبان بولتی ہے۔
- البرٹ آئن اسٹائن نے ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔ اس وقت اس کی عمر ۷۶ برس تھی۔
- مشہور اداکار ہمفرے بوگارٹ نے ۷۶ فلموں میں کام کیا تھا۔ جن میں سے ایک فلم میں اُسے اکیڈمی ایوارڈ بھی ملا تھا۔
- یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کو دوپہر کے بارہ بجنے میں ۷۶ سیکنڈ باقی تھے کہ طوکیو (جاپان) میں ایک شدید زلزلہ آیا جس کے باعث ایک لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوگئے اور تقریباً ۵ لاکھ مکانات تباہ ہوئے۔
- قدیم روم کے عظیم الشان تھیٹر کلوزیم COLOSSEUM میں ۵۰ ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور اس میں داخل ہونے کے ۷۶ راستے تھے۔
- پورے برطانیہ میں ٹینس کے فقط ۷۶ کورٹس ہیں۔ جبکہ فرانس میں اتنے کورٹس تو صرف ایک ہی شہر پیرس میں موجود ہیں۔

(۷۷)

- خواجہ الطاف حسین حالی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ۷۷ برس کی عمر میں ہوا تھا۔

- ۱۹۸۷ء میں منعقد ہونے والے ریلائنس ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ میں بطور انعام دیے جانے والے کپ کی قیمت ۷۷ ہزار ڈالر تھی۔
- ۱۹۶۰ء میں امریکی آبدوز ٹرائی ٹن نے دنیا کے گرد ۷۷ دن میں ایک مکمل چکر لگایا اور ۳۶۰۱۴ میل کا فاصلہ طے کیا۔ اس سفر میں ٹرائی ٹن ایک مرتبہ بھی سطح سمندر پر نہیں ابھری۔
- چین کے سابق وزیر اعظم چواین لائی کا انتقال ۱۹۷۶ء میں ہوا۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۷۷ برس تھی۔
- برطانیہ کے بادشاہ ایڈورڈ پنجم نے صرف ۷۷ دن حکومت کی تھی۔
- انٹارکٹیکا میں برف کا گلیشیر ۴۷۷ میٹر فی ہفتہ کی رفتار سے سفر کرتا ہے۔ جو گرین لینڈ میں برف کے گلیشیر کی رفتار کا ایک تہائی ہے۔
- دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ کی ۷۷ آبدوزیں غرقاب ہوئی تھیں۔
- دنیا کے آتش فشاں پہاڑوں میں ماؤنٹ ایریبس سب سے زیادہ جنوب میں واقع ہے۔ یہ آتش فشاں پہاڑ ارض بلد ۷۷ درجے جنوب پر واقع ہے۔
- مشہور مسلمان سائنسدان ابوالقاسم الزہراوی کا انتقال ۱۰۱۳ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۷ برس تھی۔

۷۸

- فضا میں سب سے زیادہ پائی جانے والی گیس نائٹروجن ہے۔ جو فضا میں حجم کے لحاظ سے ۷۸.۹ فیصد پائی جاتی ہے۔
- گھڑی کے ڈائل پر موجود تمام ہندسوں کا مجموعہ ۷۸ ہوتا ہے۔
- ایک سیزن میں کسی وکٹ کیپر کا سب سے زیادہ کیچ پکڑنے کا ریکارڈ ۷۸ کیچ ہے۔ جو گلوسسٹر شائر کے والٹر ہیمنڈ نے ۱۹۲۸ء میں قائم کیا تھا۔
- مدر ٹریسا نے ۱۹۷۹ء میں امن کا نوبل انعام حاصل کیا۔ وہ امن کا نوبل انعام حاصل کرنے والی ۷۸ ویں شخصیت ہیں۔
- ہندی تقویم عیسوی تقویم سے ۷۸ سال پیچھے ہے۔
- امریکہ کے ساتویں صدر اینڈریو جیکسن امریکہ کے پہلے صدر تھے۔ جن کی تصویر سرکاری طور پر کھینچی گئی۔ اس تصویر کے کھینچوانے کے وقت ان کی عمر ۷۸ برس تھی۔
- ہیتھرو ایئر پورٹ لندن پر ایک گھنٹے میں ۷۸ جہاز اُترتے ہیں، یا پرواز کے لیے پَر تولتے ہیں۔
- باسکٹ بال کی گیند کا محیط زیادہ سے زیادہ ۷۸ سینٹی میٹر ہوتا ہے۔
- برطانیہ کی ۷۸٪ آبادی شہروں میں رہتی ہے۔
- گاندھی کو ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو قتل کیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۸ برس تھی۔

(۷۹)

- مشتاق محمد نے اپنے ٹیسٹ کیریئر میں ۷۹ وکٹیں حاصل کی تھیں۔
- ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی تعمیر سے پہلے دنیا کی بلند ترین عمارت کرسلر بلڈنگ سمجھی جاتی تھی۔ اس بلڈنگ کی اونچائی ۱۰۴۸ فٹ ہے اور اس میں ۷۹ منزلیں ہیں۔
- سونے کا کیمیائی عدد ۷۹ ہے۔
- ۲۸ جولائی ۱۹۴۵ء کو شدید دھند کے باعث ایک بی۔ ۲۵ بمبار طیارہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی ۷۹ویں منزل سے ٹکرا گیا۔ اس حادثے میں ۱۳ افراد ہلاک ہوئے تھے۔
- کلکتہ کی ۷۹٪ آبادی ایک کمرے والے مکانوں میں رہتی ہے۔
- ملکہ وکٹوریہ کے ولی عہد ایڈورڈ ہفتم نے ۷۹ برس تک اپنی تخت نشینی کا انتظار کیا تھا۔
- آلو میں ۷۹٪ پانی ہوتا ہے۔
- ۷۹ء میں ماؤنٹ ویسوویس کے پھٹنے سے پومپیائی کا شہر تباہ و برباد ہو گیا تھا۔

(۸۰)

- پاکستان کا قومی ترانہ بجنے میں ۸۰ سیکنڈ صرف ہوتے ہیں۔
- سر ڈان بریڈمین نے اپنے ٹیسٹ کیریئر میں ۸۰ اننگز کھیلی تھیں۔
- سر سید احمد کا انتقال ۸۰ برس کی عمر میں ہوا تھا۔
- "دنیا کے گرد اسی دن میں" جیولس ورنے کا مشہور و معروف ناول ہے۔
- گرین لینڈ کا ۸۰٪ حصہ گلیشیرز پر مشتمل ہے۔
- جرمن ہواباز بیرون مینفرڈ وان رچ تھوفن نے پہلی عالمی جنگ میں اتحادیوں کے ۸۰ ایئر کرافٹ تباہ کیے تھے۔
- اگاتھا کرسٹی کا مشہور ڈرامہ "دی ماؤس ٹریپ" دراصل ایک ریڈیائی ڈرامہ تھا جو بی بی سی نے ملکہ میری کی ۸۰ویں سالگرہ پر نشر کرنے کے لیے لکھوایا تھا۔
- آسکر ایوارڈ حاصل کرنے والے دنیا کے معمر ترین اداکار جارج برنس ہیں۔ جنہوں نے یہ ایوارڈ ۱۹۷۶ء میں ۸۰ برس کی عمر میں حاصل کیا۔
- دنیا میں عورتوں کی اوسط عمر سب سے زیادہ جاپان میں ہے۔ وہاں عورتیں اوسطاً ۸۰۔۸۱ سال تک زندہ رہتی ہیں۔
- گوتم بدھ کا انتقال ۴۸۳ ق م میں ۸۰ برس کی عمر میں ہوا تھا۔

آپ بیتی
خصوصی انعام

سچّی آپ بیتی

ڈاکٹر تسنیم شکیل احمد

سرزمینِ حجاز کا ایک سچا اور روح پرور واقعہ

یہ سطور تحریر کرتے وقت میں عجیب سے احساسات سے دوچار ہوں۔ پتا نہیں مجھے یہ واقعہ لکھنا بھی چاہیے یا نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات رحمت و مہربانی کا سرچشمہ ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کس قدر مہربان ہے۔ ہمیں یقیناً اس سے اچھی امیدیں اور نیک گمان وابستہ کرنا چاہیئے۔ ہر وقت اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اپنے گناہوں

پر مغفرت طلب کرنی چاہیے۔ جو کچھ میں لکھنا چاہ رہی ہوں، میری زندگی کا ایک خوشگوار اور انوکھا واقعہ ہے۔ جس پر میں حیران بھی ہوں اور شکر گزار بھی۔

یہ غالباً ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے۔ ہم روضۂ رسولؐ پر حاضری دینے کے بعد دہران کے سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ ابھی ہم مدینہ منورہ کے اطراف کھجوروں کے باغ سے گزر رہے تھے کہ پکی پکی کھجوریں دیکھ کر میرا کھجوریں لینے کا بڑا ہی دل چاہا۔ یہاں یہ بھی بتاتی چلوں کہ کھجوریں مجھے انتہا سے زیادہ پسند ہیں۔ اتنی کہ ساری زندگی مجھے صرف کھجوریں ہی کھانے کو ملیں تو میں بخوشی ان پر گزارہ کر سکتی ہوں۔ کسی دوسرے کھانے کی مجھے چنداں پرواہ نہیں ہوگی۔ بس پینے کے لیے چائے بھی ملتی رہے۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کھجوریں کیسے حاصل کروں جبکہ باغ میں کوئی نہیں تھا جس سے میں خریدتی۔ اتنی دیر میں سات سال کے فرحان کو کوئی ضرورت پڑی تو ہمیں کار روکنی پڑی۔ ہم لوگ اُتر گئے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ ابھی ہم کھڑے ہی تھے کہ سڑک کے دوسری جانب چند انتہائی سادہ لباس جیسے پاکستانی قبائلی لباس میں ملبوس ہوں، ایسے لوگ جا رہے تھے۔ اچانک بغیر کسی تمہید کے ان میں سے کسی نے ایک پیکٹ اُچھالا جس کو ہم نے بھی بغیر کسی جھجھک کے غیر ارادی طور پر خود بخود کیچ کر لیا۔ اس پیکٹ میں آدھ کلو کے قریب کھجوریں تھیں۔

سوائے کھجور اُچھالنے اور کیچ کرنے کے ہم دونوں گروپوں میں کوئی بھی بات چیت نہیں ہوئی۔ میں نے بھی ایک منٹ دیر کیے۔ بغیر لفافہ لے لیا اور بغیر کسی تکلف کے کھجوریں کھانے لگی۔ جبکہ عام حالات میں میرے لیے یہ بالکل ناممکن تھا کہ میں اس طرح بالکل اجنبی لوگوں سے کوئی چیز لیتی اور کھانے بھی لگتی۔

یہ سب کچھ اچانک ہوا اور اتنے فطری انداز میں ہوا کہ اُس وقت سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ بس ہم چُپ چاپ دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ مہربان لوگ دُور چلے گئے۔ پتا نہیں کہاں۔

میں آج بھی بہت حیران ہوتی ہوں کہ شاید اللہ میاں نے اپنے حبیبؐ کے صدقہ میں مدینۃ الرسُول کی پاک سرزمین میں ایک ادنیٰ ترین کلمہ گو کو بھی مہمان سمجھا اور کھجور کھانے کی خواہش کو اتنے اچھوتے انداز میں پورا فرمایا۔ شاید اس لیے کہ اُس کے پاک نبیؐ کی مہمان نوازی بے نظیر تھی۔ اور اُس سخی اور غنی جلیل القدر پیغمبرؐ کے شہر سے اُس کے ایک اُمتی کو اللہ خالی ہاتھ نہیں بھیج سکتا تھا۔

تمام تعریف اُس خدا کے لیے جو سارے جہانوں کا رب ہے اور لاکھوں درُود و سلام اُس کے پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

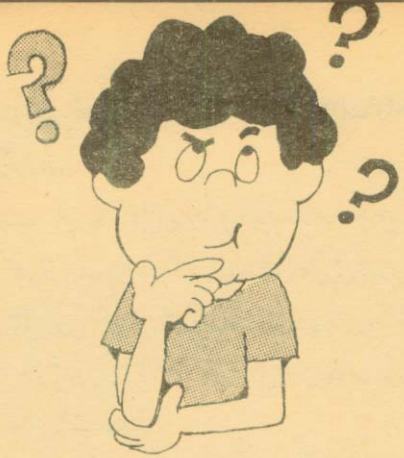

حرفوں کا گورکھ دھندا

ترتیب وتخلیق :- عظیم مُغل

"حرفوں کا گورکھ دھندا" شائع کرتے ہوئے ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ہمیں آئندہ ماہ بھی اس مقابلے کو شائع کرنا پڑے گا۔ چونکہ شرکاء کی بہت بڑی تعداد کو انوکھی طرز کا یہ مقابلہ بے حد پسند آیا اور بیشتر نے اسے جاری رکھنے کی فرمائش کی۔ اس لئے ہم اسے دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ مگر اب اس کی شکل قدرے تبدیل ہے اور شاید پہلے کے مقابلے میں کچھ مشکل بھی ...

آپ کی ذہانت کا امتحان حاضر ہے ... طریقہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ ہم نے آپ کو سمجھانے کی خاطر ایک واقعے کو پُر کر دیا ہے ...

آپ ہر خانے میں ایک حرف اس طرح بھریں کہ ایک قطار میں موجود حروف مل کر ایک لفظ بنالیں۔ اسی طرح تمام الفاظ مل کر ایک بامعنی جُملہ بن جائے۔ حروف پُر کرنے کے علاوہ نیچے مکمل جملہ بھی لکھ دیں تاکہ پہلی نظر میں سمجھا جاسکے صرف بامعنی جملہ انعام کا حق دار نہ ہوگا بلکہ ایسا خوبصورت جملہ جس کے اندر کوئی علمی بات، کوئی حکیمانہ نکتہ یا کوئی اچھا قول پنہاں ہوگا انعام اسی کو دیا جائے گا۔ یاد رہے قرعہ اندازی کے ذریعے صرف تین انعامات دیئے جائیں گے۔ مقابلے میں شریک ہونے کی آخری تاریخ ۱۰ اکتوبر ہے۔ اس لئے تاخیر بالکل نہ کیجئے۔

نتائج مقابلہ ستمبر

ستمبر کے مقابلے میں سینکڑوں جوابات موصول ہوئے مگر خوبصورت اور بامعنی جُملے کم تھے۔ یا اگر کوئی اچھی بات تھی بھی تو جُملے کی ساخت اور بناوٹ زبان کے اعتبار سے اچھی نہ تھی۔ تاہم چند منتخب جملے اور بھیجنے والوں کا نام بھی شائع کیا جارہا ہے اور ان تین خوش نصیبوں کا نام بھی جن کے بھیجے ہوئے جملوں کو بہترین قرار دیا گیا۔

بہت سے خوبصورت جُملے ڈاک میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے

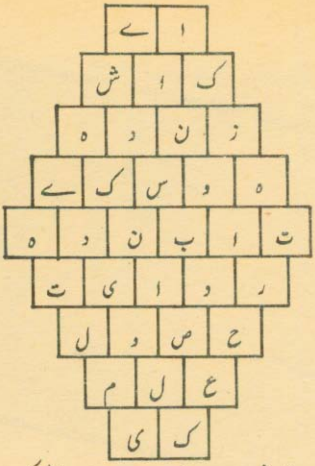

پہلا انعام

جب پیئو پانی الحمد پڑھو خدا کی ۔ صبا ثروت ، ناظم آباد کراچی

اے ماں تیرے قدموں نیچے جنت ہے ، محمد اسلم قریشی ، کراچی

دوسرا انعام

سچ بول تیری عاقبت سنور جائے گی ، عظمیٰ ادریس ، رامسوامی کراچی

ہے جان میری امانت میرے خُدا کی ۔ عافیہ ناز ، بوریوالہ

تیسرا انعام

اے وطن میری زندگی تیرے لئے ہے ۔ کاشف شرافت ایم جی خان روڈ

جو بات بولو ہمیشہ پہلے سوچ لو ۔ محمد فیصل ، ٹنڈو الہ یار

چند منتخب خوبصورت جُملے

ہے علم حاکم محکوم دولت مال ہے ۔ حافظ محمد بن مالک ، دستگیر کراچی

جو کام کرنا ہو پہلے محنت ہمت سے ، جمیل عزیز ، کراچی

ہم عہد کریں حفاظت کریں ملک کی ۔ واجد علی ، سانگھڑ

اے خدا یہاں شریعت نافذ کرا دے ، محمد سلیم قریشی ، کراچی

اے خدا اچھا انسان مجھے بنا دے ۔ آصف رضا ، گدو

اے خدا مالک ہمارے ہمیں بخش دے ، محمد طیب ، نارتھ کراچی

تم میں بہتر انسان صابر شخص ہے ، شہزاد عمران ، گوجرانوالہ

تم کرو محنت زندگی سنور جائے گی ، ناصر ذیشان ، لاہور

دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کر ، صائمہ خالد ، راولپنڈی

ہے جان میری قربان میرے وطن پر ، راشد ، حیدر آباد

تم کیا اپنی شناخت بھول گئے ہو ، نارتھ ناظم آباد کراچی

اِک خُدا رسُول ہمارا قرآن بھی اِک ، محمد زبیر ، گجرات

اے خدا ہمیں انسانِ صالح بنا دے ، انجم اسلام ، جیکب آباد

کر کام ایسے ، سُرخرو دُنیا میں ہو ، افتخار حسن ، بہاولپور

وہ عمل اچھا بنیاد جس کی علم ہے ۔ شہلا خانم ، کراچی

اے خُدا کر نا حفاظت میرے وطن کی ، عمران مبارک ، ناظم آباد کراچی

ہے علم دولت واسطے طالب علم کے ، حنا جاوید ، واہ کینٹ

اس ماہ آنکھ مچولی اچھا آیا ۔ عابدہ ، فیڈرل بی ایریا ، کراچی

تم کرو اپنا کردار بلند علم سے ، اشفاق احمد ، حیدر آباد

سچ بول ورنہ مصیبت سہنا پڑے گی ، زاہد نور ، کرک

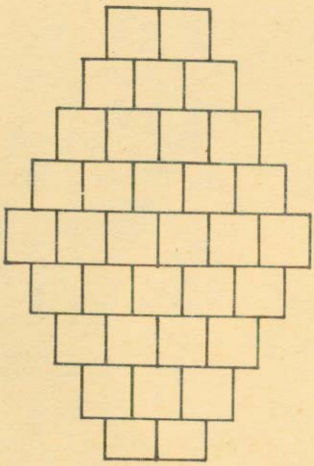

اے کاش زندہ ہو سکے تابندہ روایت حصولِ علم کی

جُملہ ــــــــــــــــــــــــ

نام طالب علم ــــــــــــ کلاس ــــــ

تعلیمی ادارہ ــــــــــــــــــ

پتہ ــــــــــــــــــــــــ

ــــــــــــــــــــــــ

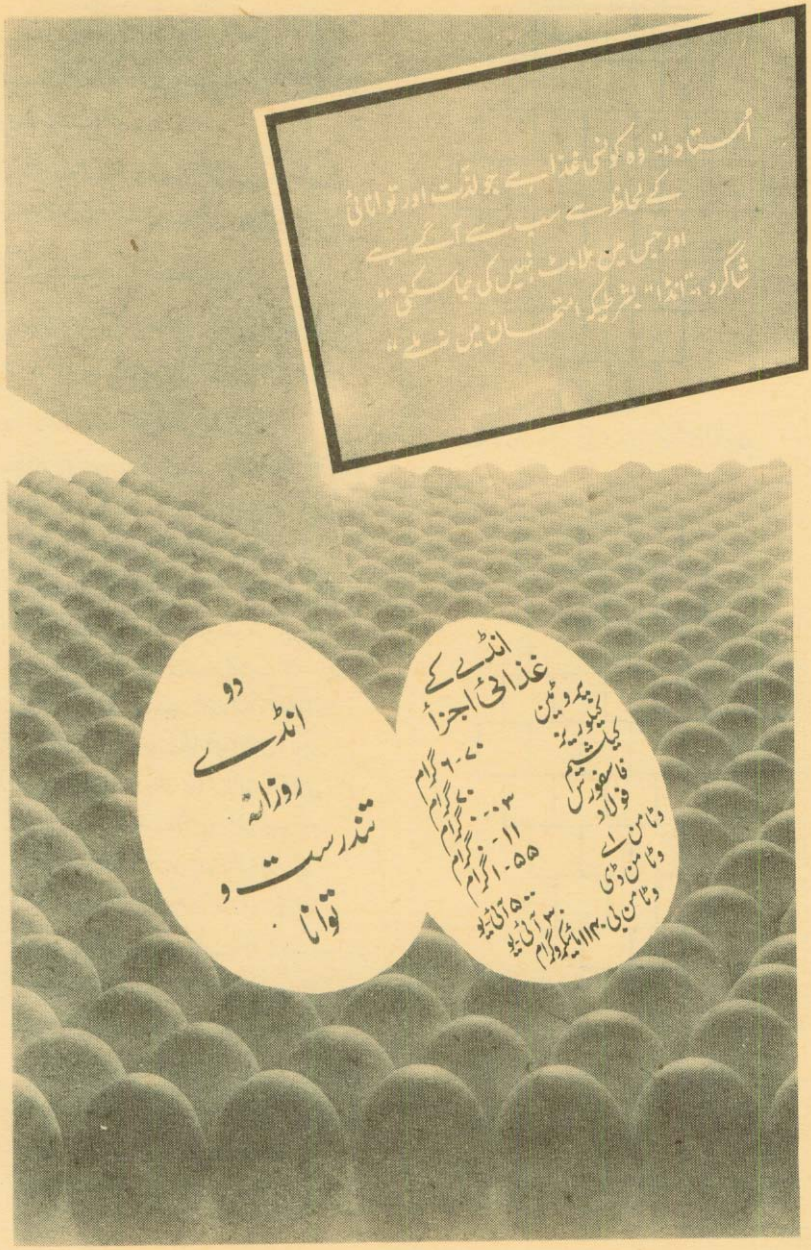

اُستاد: "وہ کونسی غذا ہے جو لذت اور توانائی
کے لحاظ سے سب سے آگے ہے
اور جس میں ملاوٹ نہیں کی جاسکتی"
شاگرد: "انڈا" بشرطیکہ امتحان میں نہ ملے"
دو
انڈے
روزانہ
تندرست و
توانا
انڈے کے
غذائی اجزا
ہیمووٹمن ٦.٧٠ گرام
کیلشیم
فاسفورس
فولاد
٠.٠٣ گرام
٠.٧ گرام
١١.٠ گرام
١.٥٥ گرام
وٹامن اے ٥٠٠ آئی یو
وٹامن ڈی ٣٠ آئی یو
وٹامن بی-١٢ ١١٠ مائیکروگرام

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شُدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بددیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شُدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شُدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھی نگارشات کے آخری صفحے پر دیکھیے۔)

اچھّی باتیں

مرسلہ: عزّت خان، منڈی ارباب - پشاور

آؤ بتائیں کام کی باتیں
راحت کی آرام کی باتیں
اچھے اچھے بچے ہو تم!
قول کے اپنے سچے ہو تم
اچھے اچھے کام کرو تم
روشن اپنا نام کرو تم

صبح سویرے اُٹھنا سیکھو
سُست روی سے بچنا سیکھو

اپنے خدا کو یاد کرو تم
دم جو بھرو تو اُس کا بھرو تم

جب بھی ڈرنا اُس سے ڈرنا
اور کسی کی فکر نہ کرنا

خوب لکھو تم خوب پڑھو تم
جلدی جلدی آگے بڑھو تم

اپنے بڑوں کی عزت کرنا

میں پھر بھی فائدے میں ہوں

وحید احمد تبسم، چکوال

"کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ"

"ارے بھئی ہم ہیں۔"

"ہم تو اندر ہیں"

"ارے یار میں ہوں میں!"

"میں بھی یہیں ہوں"

"یار میں... محمد عبدالواحد"

"تو یوں بکو نا... کھٹاک"

"ابے یار مروادیا۔ مروادیا... دھوپ میں کھڑے کھڑے۔"

"ارے ارے کیوں؟ کیا ہم شیطان ہیں؟"

"شیطان تو نہیں ہو... بھائی مسلمان ہو لیکن اس وقت شیطان تمہاری کھوپڑی شریف پر سوار ہے"

"ارے لاحول ولاقوۃ۔ کدھر کدھر بھئی ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ کسی کے گھر جاتے تو پہلے سلام کرتے اور یہی نصیحت انہوں نے اپنے چاہنے والوں کو بھی کی، لیکن انسان کا ازلی دشمن شیطان کب چاہتا ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلیں"

"اچھا یہ بات ہے تو... السلام علیکم"

"وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ"

"اسکول تو کھل گئے۔ آج گئے تھے؟"

"ہاں گیا تھا۔ تم کیوں نہیں آئے؟"

"بھئی آج پہلا دن تھا۔ بہت مزا آیا۔ تمام پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی اور اسمبلی میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی عمدہ تقریر کی۔"

"کیا کہا اُنہوں نے؟"

گھنٹی لگنے کے بعد جب ہم قطار بنا کر کھڑے ہوئے تو سب سے پہلے دسویں جماعت کے قاری سبحان اللہ نے سورۂ عصر کی تلاوت کی، پھر ہیڈ ماسٹر صاحب آگے بڑھے اور انہوں

نے ایک بڑا عجیب سا سوال پوچھا۔

"وہ کیا؟"

سُنو تو۔ انہوں نے پوچھا اگر کوئی شخص دھوپ میں برف لیے بیٹھا ہو تو کیا ہوگا...؟

"بے کار پگھل جائے گی۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"ارے یار۔ بولو نہیں۔ سب نے یہی کہا جو تم نے کہا۔ پھر ہیڈ ماسٹر صاحب کہنے لگے کہ اگر اس کو پانی سے بھری ہوئی بالٹی میں ڈال دیں تو؟"

"تو پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ لوگ پیئیں گے ... دُعائیں دیں گے۔ برف کام بھی آئے گی۔"

"یار پھر تم بولے۔ ہاں تو نویں جماعت کے ایک لڑکے نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو یہی جواب دیا تو وہ کہنے لگے کہ عزیز بچو! بس یہی حال زندگی کا ہے۔ کہ یہ برف کی طرح پگھل رہی ہے۔ ہر سانس میں زندگی ایک لمحے کم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ تمام انسان گھاٹے میں ہیں (یعنی زندگی سب کی ختم ہو رہی ہے) سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اچھے اعمال کیے، ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور صبر کی تلقین کی۔ (یعنی جو اپنی زندگی استعمال میں لے آئے وہ تو گھاٹے میں نہ رہے، نفع میں رہے، لیکن جو لوگ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ ضرور گھاٹے میں رہیں گے۔) ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی اچھی اچھی مثالوں سے یہ بات سمجھائی کہ کاش تم موجود ہوتے۔"

"ہاں یار واقعی میں بڑی انمول دولت سے محروم رہ گیا۔ پھر بھی کوئی نقصان نہیں ہُوا۔ تم نے تو یہ بات مجھ کو بتا دی۔ اب میں تمام اچھی باتوں پر عمل کروں گا۔ اور اپنے دوستوں کو تمام اچھی باتوں کی تلقین کروں گا تمہاری طرح!!"

حضرت خالدؓ بن ولید

اطہر بلال کھوکھرا پار۔ کراچی

حضرت خالد بن ولیدؓ اسلام کے وہ عظیم سپہ سالار تھے جنہوں نے مختلف جنگوں میں مشرکین کی فوجوں کو شکست دے کر اسلام کا پرچم بلند کیا۔ آپ کو حضورؐ نے سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا لقب عطا فرمایا۔

آپؓ قریش کے ایک اونچے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جنگِ اُحد تک مسلمانوں میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے فوجِ کفار کی کمان انھی کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے حملوں سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا تھا۔

فتح مکہ سے پہلے آپؓ مدینہ پہنچے اور سنہ ۸ھ میں اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد جنگِ موتہ میں مسلمانوں کی فوج کے کمانڈر بنے۔ آپ کے لشکر کی تعداد تین ہزار تھی۔ آپؓ نے ایک لاکھ رومی لشکر کو اس طرح شکست دی کہ وہ فتح سے مایوس ہوکر بھاگ گئے۔ اس جنگ میں خالدؓ کے ہاتھوں نو تلواریں ٹوٹیں۔ جس کی وجہ سے حضرت محمدؐ نے آپؓ کو "سیف اللہ" کا خطاب دیا۔ آپؓ حنین کی جنگ

میں زخمی ہوئے۔ طائف کی جنگ میں کامیابی حاصل کی اور چھوٹے چھوٹے معرکوں میں بھی شریک ہوئے۔

حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جتنے فتنے اُٹھے اُن کی روک تھام کے لیے آپؓ نے شاندار کارنامے انجام دیے۔ پھر رومیوں اور ایرانیوں کے خلاف معرکہ آرا ہوئے اور دمشق کو فتح کیا۔ پھر یرموک کے میدان میں جب رومی دو لاکھ کا لشکر لے کر آئے تو آپؓ نے اپنے بکھرے ہوئے دستے جمع کر کے اُنھیں شکست دی۔ آپؓ نے اپنے جسم کے ہر حصے پر تیروں اور تلواروں کے زخم کھائے۔ آپؓ کم و بیش سو اسو لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ آپ کچھ عرصے کے لیے شام کے کچھ علاقے کے گورنر بھی رہے۔

حضرت خالدؓ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ میدان جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہوں۔ لیکن بیمار ہونے کے باعث ہجرت کے بائیسویں سال ۲۱ھ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں آپ کا انتقال ہو گیا

روبوٹ

جدید معلومات افزا مضمون

وحید احمد تبسم، چکوال

وہ اکیلا ہی ایک بہت بڑے ہال نما کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سارے ہال سے وہ اسٹیج تین فٹ اونچا تھا جس کی ایک دھاتی کرسی پر وہ بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ اس کی توجہ ہر چیز سے ہٹی ہوئی تھی۔ اور وہ سیدھا ایک آئینے میں گم سُم تکے جا رہا تھا۔ لوگ ہجوم کی شکل میں بڑے دروازے سے باری باری داخل ہوتے اور اپنی اپنی نشستوں پر آ بیٹھتے۔ سب لوگوں کی نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ تھا کہ ہر چیز سے بے نیاز بیٹھا تھا، یوں لگتا تھا کہ جیسے عنقریب وہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینے والا ہے۔

ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا اور سب لوگ غور سے اُس کی طرف متوجہ تھے، اچانک اُس کے آہنی ہاتھ حرکت میں آئے اور سامنے رکھے بورڈ کے مختلف حصوں پر اس کی انگلیاں ایک ماہر فنکار کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھرنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی سارا ہال موسیقی کی خوبصورت دھنوں اور دلکش گیت کے تانوں سے گونجنے لگا۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اُن سب کے چہروں پر خوبصورت موسیقی سُننے کی وجہ سے مسرت کے اَن گنت رنگ بکھر گئے تھے۔

مگر موسیقی بجانے والے کے چہرے پر کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہ ہوئی تھی۔ وہ ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر لگاتار موسیقی کی دُھنیں ہر طرف بکھیرتا جا رہا تھا اور لوگوں کے دلوں کو خوش کرتا جا رہا تھا۔

موسیقی کی یہ خوبصورت دُھنیں ہر طرف بکھیرنے

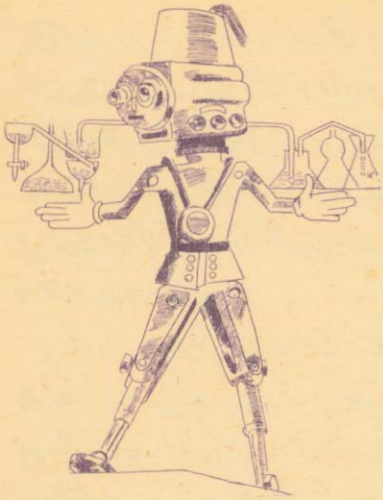

والا وہ ماہر فنکار، انسان نہیں، بلکہ روبوٹ تھا جو اپنے آہنی ہاتھوں، لوہے اور پلاسٹک کے الیکٹرونی پُرزوں کی بدولت ایک ماہر موسیقار بن گیا۔ یہ روبوٹ دورِ جدید میں سائنسی ترقی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

موسیقی بجانے والا یہ مشینی آدمی جسے عُرفِ عام میں روبوٹ کہیں گے، جاپان کی سائنسی نمائش میں سب سے زیادہ پسند کیا گیا اور اُسے "سُپر سٹار" کا خوبصورت نام عطا ہوا۔ اس سائنسی نمائش کا افتتاح اپریل ۱۹۸۵ء ٹوکیو (جاپان کا شہر) سے تقریباً ستر کلومیٹر دُور کیو باشہر کے نزدیک ہوا۔ یہ نمائش دو سو پچاس ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس نمائش کو دیکھنے کے لیے حکومت نے پورے مُلک کے شہروں میں رعایتی ٹکٹوں پر بسیں چلائیں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سائنسی نمائش کو دیکھ سکیں اور جدید سائنسی ایجادات سے متعارف ہو سکیں۔ تقریباً ۶ کروڑ افراد نے اس نمائش کو دیکھا اور سب لوگوں نے اس نمائش کی جس چیز کو زیادہ پسند کیا وہ موسیقار روبوٹ تھا۔ جس کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے۔

اس مشہور روبوٹ کو دیکھ کر پہلی نظر میں انسان اندازہ لگا لیتا تھا کہ وہ نمائش دیکھنے کے لیے آنے والے لوگوں کا دل لُوٹ لے گا۔ اور یہ بات واقعی سچی تھی۔ کیونکہ اس ہال کے باہر جس کے اندر اُسے رکھا گیا تھا۔ ہر وقت لوگوں کا مجمع دیکھنے میں آتا تھا

اس روبوٹ میں سترہ کمپیوٹر، ایک ٹیلی وژن کیمرہ اور بال سے بھی زیادہ باریک تاریں نصب تھیں۔ یہ تاریں اس کے تمام جسم پر پھیلی ہوئی تھیں جس طرح آدمی کے جسم کے اندر چھوٹی چھوٹی رگیں اور شریانیں ہوتی ہیں۔ جو خون کو جسم کے تمام چھوٹے بڑے حصّوں تک پہنچانے کا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس روبوٹ کے پچاس مختلف جوڑ تھے، اُسے جاپان کی سومیٹو موالیکٹرک کمپنی کے بیالیس انجینئروں نے آٹھ سال کی سخت محنت کے بعد تیار کیا۔

اس روبوٹ سے چند سو میٹر کے فاصلے پر اس کے دوسرے بہن بھائی رکھے گئے تھے۔ جنھیں جاپان کی مختلف کمپنیوں نے تیار کیا تھا۔ ان میں

کوئی تو برف سے برفانی آدمی بنا رہا تھا اور کوئی کسی تھیٹر میں مختلف کرتب دکھا رہا تھا۔ اور لوگوں کو محظوظ کر رہا تھا۔ کوئی کار کے ماڈل بنا کر بڑی مہارت کے ساتھ اُس کے مختلف حصّوں کی ویلڈنگ کرنے میں مصروف تھا۔ کوئی معذور افراد کو نہایت محبت اور احتیاط سے کھانا کھلا رہا تھا۔

اس نمائش میں توشیبا کمپنی کے بنائے ہوئے ننھے مُنّے روبوٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے اور ٹھگنے روبوٹوں کی مہارت اور فنکاری کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہ ننّھے جیسی چھوٹی چیز کو مہارت سے پکڑ کر پوری رفتار سے گھما سکتے تھے۔

ان ٹھگنے اور بونے روبوٹوں کے بالکل سامنے دیو قامت اور لمبے قد والے دوسرے روبوٹ بھی رکھے گئے تھے، جو اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے نہایت بدصورت اور خوفناک تھے۔ انہی روبوٹوں میں سب سے بڑا روبوٹ "آرڈل" نامی رکھا گیا تھا۔ جس کا قد ۱۵ فٹ اور وزن ۲۵ ٹن تھا۔ وہ اپنے بے پناہ طاقت والے بازوؤں سے ٹنوں وزنی لوہے کے گارڈر اور بھاری بھاری مشینیں ایک ہی بار اُٹھا کر لوگوں کے سامنے اپنی بے پناہ طاقت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ یہ عمل بار بار دہرا رہا تھا، مگر تھکاوٹ اُس کو چھُوتی بھی نہیں تھی اور نہ اُس کے بازو تکان محسوس کرتے تھے۔ بس

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں۔

وہ کسی دیو ہیکل جن کی طرح اپنی ہی دُھن میں لگا ہوا تھا۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ ایک بے جان جسم اتنے سارے کام کیسے سرانجام دے سکتا ہے؟ تو آیئے روبوٹ جیسے بے جان جسم کے بارے میں دیکھیں کہ یہ کیسے کام کرتا ہے۔ یہ کیسے معرضِ وجود میں آیا۔ اس کا خیال دنیا کو سب سے پہلے کس نے پیش کیا۔ یہ مزید کیا کام سرانجام دے سکتا ہے اور مستقبل میں یہ ہمارے لیے کیا کچھ کرے گا؟

موجودہ دور جسے بیسویں صدی کا نام دیا گیا ہے میں جو بڑی بڑی ایجادات ہوئیں اُن سب میں روبوٹ زیادہ اہم اور قابلِ ذکر ہے۔ اس ایجاد نے انسان کو ایک نئے راستے پر گامزن کر دیا ہے۔ اور آدمی کے لیے ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کیا ہے۔ یہ انسانی دماغ کا بہترین کارنامہ ہے۔ آج سے

دھڑتھے، جو چابی دینے پر خود بخود حرکت کرتے اور ہدایات کے مطابق عمل کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں دنیا کا پہلا مکمل روبوٹ جرمنی ہی میں ایک گھڑی ساز نے تیار کیا، مگر اس میں یہ کوتاہی تھی کہ وہ صرف ایک ہی کام کرسکتا تھا اور ہمیشہ اسی کام پر اڑا رہتا تھا، کیونکہ اس کی ساخت ہی اتنی سادہ تھی۔

روبوٹ کسی پیچیدہ نظام کا نام نہیں بلکہ ہر مشین روبوٹ کہلاتی ہے۔ روبوٹ کا دراصل مطلب ہی یہ ہے کہ ہر وہ مشین جو خود بخود کام کرے، کام کرنے میں مدد دے، کام میں آسانی پیدا کرے۔ روبوٹ کہلاتی ہے۔ روبوٹ کو چلانے اور کام میں لگانے کے لیے اس میں کمپیوٹر کی شکل میں اسے دماغ دیا جاتا ہے جو اُسے کنٹرول کرتا ہے۔ سائیکل ایک سادہ سی مشین ہے اور جب ہم اس میں ایک ہلکا سا کمپیوٹر لگا دیں جو اُسے صحیح سمت میں رکھ سکے، رش کے موقعے پر بریک لگا کر کھڑا کرے۔

صرف تیس برس پہلے دنیا کا سب سے پہلا جدید روبوٹ بن کر دنیا کے سامنے آیا اور لوگ پہلی مرتبہ روبوٹ کے لفظ سے واقف ہوئے۔ روبوٹ بنانے کا سب سے پہلا خیال اور نظریہ فرانسیسی انجینئروں نے پیش کیا۔ اس کے بعد جرمنی کے گھڑی سازوں نے اس نظریے کو عملی جامہ پہنا کر سب سے پہلا روبوٹ کا نمونہ تیار کیا۔ وہ روبوٹ کو اپنی میکانی زبان میں آٹومشین کہتے تھے۔ یہ آٹومشین دراصل انسانی مجسمے یا جانوروں کے

رش کے ختم ہونے پر خود بخود چل پڑے، ایسے سائیکل کو بھی ہم روبوٹ کا نام دیں گے۔ آپ کے گھروں میں رکھا ہوا فریج بھی ایک روبوٹ کی شکل ہے جو آپ کے لیے خود بخود برف بناتا رہتا ہے چیزیں ٹھنڈی رکھتا ہے، کھانا خراب ہونے سے بچاتا ہے۔ یہ سارے کام وہ آپ کی مدد کے بغیر سارا دن کرتا رہتا ہے اور اس میں دماغ کی جگہ بجلی کام کر رہی ہوتی ہے۔ کمروں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایئر کنڈیشنر بھی روبوٹ کہلاتا ہے، کیونکہ وہ آپ کی مدد کے بغیر سارا دن خود بخود گرم کمروں کو ٹھنڈا کر کے آپ کو گرمی سے بچاتا اور سکون دیتا ہے۔ آپ کی موٹر سائیکل کار بھی، روبوٹ ہے۔ جو صرف گیئر لگانے سے ہر طرف بھاگم بھاگ جاسکتی ہے۔ گاڑی میں پٹرول اور اسٹیئرنگ اس کے دماغ کی شکل میں کام کر رہے ہیں، مگر یہ تمام مشالیں نامکمل روبوٹ کی ہیں، کیونکہ ان میں دو بڑی خامیاں ہیں۔ اوّل یہ کہ ان میں کمپیوٹر نصب نہیں ہوتا اور دوئم یہ کہ یہ ایک وقت میں صرف ایک کام سرانجام دے سکتی ہیں اور ہمیشہ ایک ہی کام کرنے پر مجبور ہیں۔ کمپیوٹر کے ساتھ چلنے والا روبوٹ ہی درحقیقت مکمل روبوٹ کہلوانے کا مستحق ہے۔ اس روبوٹ کا اندرونی نظام نہایت پیچیدہ اور مشکل ہوتا ہے یہ ایک ہی وقت میں کئی کئی کام سرانجام دیتا ہے۔ آپ جدید کیلکولیٹر کو ہی لے لیں۔ یہ آپ کے لیے

سوالات حل کر سکتا ہے، وقت بتا سکتا ہے تاریخ بتا سکتا ہے۔ اذان دیتا ہے۔ دن رات کا درجۂ حرارت بتاتا ہے اور خبریں سنا سکتا ہے۔ ایسی مکمل مشین جو کئی کام سرانجام دے سکتی ہو، مکمل روبوٹ کہلاتی ہے، بشرطیکہ اُس میں کمپیوٹر بھی نصب ہو۔

اس وقت دنیا میں مشہور ترین دو روبوٹ ہیں جو ہر کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ جاپان کی ایک مشہور "ناکاسو" فیکٹری میں بنے ہیں۔ ان کے نام "ڈ۔ ٹو آر ٹو" اور "تھری پی او سی" ہیں۔

روبوٹ انسانوں کی خدمت کرنے میں بہت مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ جدید روبوٹ ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں فٹافٹ کر سکتے ہیں۔ ہوائی جہازوں، راکٹوں اور بحری جہازوں کو پائلٹ کے بغیر چلا سکتے ہیں۔ صحراؤں کا اکیلے ہی دورہ کر کے آکر رپورٹ بنا کر مالک کو پیش کر سکتے ہیں۔ چٹکلے سُنا سکتے ہیں اور باورچی خانہ میں نت نئے کھانے پکا پکا کر بیگم صاحبہ اور بال بچّوں کو اپنا گرویدہ بنا سکنے پر قادر ہیں۔ سائنسی احکامات کو آسانی سے ریاضی کی زبان میں منتقل کر سکتے ہیں۔ گراف کھینچ سکتے ہیں۔ خیالات کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکتے ہیں اور ضرورت کے وقت دوبارہ سُنا سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنا سبق یاد کر کے دوسرے دن کلاس میں اُستاد کے پوچھنے پر سُنا دیتے ہیں۔ اور امتحان کے دوران میں سوالات کا جواب پرچے پر لکھ سکتے ہیں ـــــ اتنا کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ روبوٹ جدید زمانے کی انتہائی مفید ایجاد ہے۔ جو زندگی کے ہر شعبے میں کام سرانجام دے رہا ہے۔ اور کہیں بے ایمانی اور بد دیانتی سے کام نہیں لیتا۔

بعض لوگوں کو خدشہ اور خوف ہے کہ کہیں مستقبل میں یہی روبوٹ ہمارے حکمران نہ بن جائیں۔ اور ہم کہیں اُن کے غلام نہ ہو جائیں۔ مگر یہ سب وہم اور بے بنیاد خدشے ہیں۔ ان احمق اور بے وقوف لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ "مخلوق ہرگز ہرگز کبھی اپنے خالق کی حکمران نہیں بن سکتی۔ روبوٹ تو انسان کی مخلوق ہے" پھر وہ کیسے اپنے خالق یعنی انسان کو اپنا غلام بنا سکتے ہیں۔

ہمارے حصّہ کا انعام

لیاقت حسین۔ پاپوش نگر، کراچی

۱۴ اگست کے دن ہمارے علاقے میں جشنِ آزادی بڑی دُھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ کئی کھیلوں کے پروگراموں کے علاوہ بچّوں اور بڑوں کے لیے ایک میراتھن ریس کا مقابلہ بھی منعقد کیا جاتا ہے۔ اس بار ریس میں ہمارے ایک دوست نے حصّہ لے کر پہلی پوزیشن حاصل کی اور ایک بڑی سی ٹرافی اور نقد انعام حاصل کیا۔ جب ہمیں یہ سب کچھ معلوم ہُوا تو ہمارا دلِ حسد کے جذبات سے بھر گیا۔۔۔

"اگلی بار یہ انعام ہم جیتیں گے"

ہم نے دل میں تہیہ کر لیا۔ لیکن ہمارے ارادے کی راہ میں ایک چیز آڑے آ رہی تھی۔ ہماری سُستی۔ مگر ہم نے دل میں طے کر لیا کہ انعام حاصل کرنے کے لیے

ہم اس بار سُستی کو بھی شکست فاش دیں گے۔

ہمیں اس انعام کی فکر اس لیے بھی زیادہ تھی کہ انعام جیتنے والے دوست سے اکثر چیزوں میں ہمارا مقابلہ رہتا تھا۔ ہم ریس جیت کر اُسے نیچا دکھانا چاہتے تھے۔

ہم نے پروگرام بنایا کہ روزانہ صبح ہی صبح اُٹھ کر ایک یا دو کلو میٹر دوڑ لگایا کریں گے۔ اسی مقصد کے لیے ہم نے ٹریک سوٹ خریدا اور ہم پوری تیاری کر کے رات کو جلدی سو گئے۔ مگر جب صبح آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں۔ خیر پروگرام کل پر ٹال دیا۔ اسی طرح کئی روز گزر گئے۔

ہم نے اس مشکل کا تذکرہ اپنے دوست سے کیا تو اُس نے مشورہ دیا کہ "تم ٹائم پیس میں الارم لگا کر سو جانا اس طرح تم صبح اُٹھ جاؤ گے۔" ہم نے اس نسخے پر عمل کیا اور صبح اُٹھنے میں کامیاب ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں تیار ہو کر ہم گھر سے باہر نکل گئے۔ ابھی ہم چند سو گز ہی دوڑے تھے کہ سانس پھولنے لگی اور ہم رُکنے کی سوچنے لگے۔ کبھی خیال آتا کہ چلو گلی کی نُکڑ تک دوڑتے ہیں پھر واپس گھر کو چلیں گے۔ اب جو گلی کی نُکڑ پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک موٹا سا کُتا کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ اچانک ہی اُس کی نظریں ہماری جانب اُٹھیں بس صاحب ہم آؤ دیکھا نہ تاؤ، بھاگ کھڑے ہوئے۔

ظاہر ہے ہمارا اور اُس کا کوئی مذاق تو تھا نہیں۔ بلا وجہ کے چودہ انجکشن لگوانے پڑتے۔ ہمیں بھاگتے دیکھ کر کتا بھی ہمارے پیچھے دوڑ پڑا۔ خدا خدا کر کے ایک مناسب سی گلی میں چھُپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ کتا جا چکا ہے تو ہم اسی گلی میں آگے بڑھے۔ ہم سوچتے جا رہے تھے کہ آج تو خُوب دوڑ لگائی، ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک اُوپر والے گھر سے کسی نے گندا پانی ہمارے اُوپر پھینک دیا۔ اُوپر دیکھا تو ایک خاتون معذرت کرتی ہوئی بولیں۔

"آے لڑکے تم یہاں صبح صبح کیا کر رہے ہو؟ چلو گھر کا راستہ لو۔" اُن کے ان جملوں نے ہمارے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔ اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔ ہم کافی آگے آ چکے تو معلوم ہُوا کہ گٹر بند ہے۔ جس کی وجہ سے گلی عبور کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم نے ہمت کر کے گٹر کے پانی کو عبور کرنے کی کوشش کی۔ کوشش ناکام رہی اور ہم گٹر کے پانی میں منہ کے بَل گر کر بلبلانے لگے۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اُٹھے۔ گلی سے باہر آ کر دل کو تسلی ہوئی کہ کسی نے دیکھا نہیں۔ اب صبح کے تقریباً آٹھ بج چکے تھے۔ بچے اپنے اپنے اسکول جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک پیاری سی معصوم بچی کو دیکھتے ہوئے گزرے تو وہ بچی روتے ہوئے اپنی ماں کے پیچھے چھُپ گئی۔ بچی کی ماں نے ہماری جانب گھُورتے ہوئے ایک چوٹی ہمارے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور آگے بڑھ گئی۔ ہم اپنی حالت کی وجہ سے خاموش تھے۔ غصّے سے ہمارا بُرا حال تھا۔ ہم نے چوٹی کو ایک جانب پُوری قوت سے دے مارا اور اپنا رستہ لیا۔ ذرا آگے گئے تو دیکھا کہ بھائی جان کی گاڑی آ رہی ہے۔ ہم پیچھے ہٹے اور ایک دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ گاڑی تو گزر گئی لیکن اُسی لمحے دروازہ کھُلا اور ایک کافی صحتمند آدمی نکلا اور ہمیں ایک زناٹے دار تھپڑ لگا کر بولا۔

"کسی کے گھر میں تانک جھانک کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، کیا تمہارے گھر میں..." ابھی جُملہ مکمل نہ

ہوا تھا کہ اُن کی بیگم مولا داد لے کر نمودار ہوئیں۔ ہم نے اپنی عافیت اسی میں جانی کہ وہاں سے بھاگ جائیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا اور اگلے ہی لمحے ہم اُن سے کافی دُور جا چکے تھے۔ اپنے گھر کی گلی میں آکر ہم نے ایک نظر اپنے حُلیے پر ڈالی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے اور گندے پانی کی وجہ سے کالے کالے ہو رہے تھے۔ ہم نے گھر میں قدم رکھا تو باجی سامنے کھڑی تھیں۔ ہماری طرف دیکھتے ہی خوب ہنسیں۔ ہم شرمندہ ہو کر اپنی جگہ کھڑے اپنی حالت پہ نادم تھے۔ باجی ہمیں کمرے میں لے گئیں۔ اور آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اپنی حالت ہم سے دیکھی نہ گئی اور ہم ایک دَم سے پلٹے۔ چند قدم چلے تھے کہ ایک زوردار آواز کے ساتھ ہم ڈائننگ ٹیبل کے نیچے تھے۔ غور کرنے پر معلوم ہُوا کہ کیلے کے چھلکے سے پھسل گئے ہیں۔ ہمارے ہاتھ پاؤں سُن ہو چکے تھے۔ گھر والوں نے ہمیں باہر نکالا۔ سب کی آنکھوں سے چھلکتی مُسکراہٹ نے ہمیں شرمندہ کر دیا۔ اور دوستوں کی خوشی میں خلوصِ دل سے شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

توبہ

مُنیر احمد، پنہور، جعفر آباد

اُس دن مختار اسکول سے گھر واپس آ رہا تھا تو اُس نے دیکھا۔ اُس کے چند ساتھی غلیل سے چڑیوں کا شکار کر رہے تھے۔ اُن کی یہ حرکت اُسے بہت بُری لگی۔ اُس نے اپنے دوستوں کو سمجھانے کی کوشش کی تو سب اُس کا مذاق اُڑانے لگے۔ ایک نے کہا "مختار تم بے حد ڈرپوک ہو۔ شکار تو بہادر لوگ کھیلا کرتے ہیں۔" مختار نے اُنھیں سمجھایا کہ وہ ڈرپوک نہیں ہے، بلکہ رحمدل ہے۔ اس لئے چھوٹے چھوٹے پرندوں کا شکار اُسے پسند نہیں۔ ہاں اُن خطرناک جانوروں کے شکار سے اُسے ضرور دلچسپی ہے جو انسان کے دشمن ہیں اور جن سے عام طور پر

انسانوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ سُن کر بھی اُس کے دوست باز نہ آئے اور اُن کی غلیل معصوم چڑیوں کے خلاف برابر چلتی رہی۔

گھر لوٹ کر مختار خاصی دیر تک اُداس رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے ساتھیوں کو ظالم بننے سے کیسے روکے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن اُنھیں نصیحت ہو گئی۔

مختار کے ساتھ ایک اور لڑکا پڑھتا تھا، خادم۔ وہ تھا تو بے حد ذہین لیکن شریر بھی بہت تھا۔ ہر وقت اُسے کسی نہ کسی کو ستانے کی فکر رہتی۔ اُس کی جیب میں ہمیشہ غلیل ہوتی۔ ان لوگوں کا اسکول اس چھوٹے سے شہر کے ایک سرے پر تھا۔ اُس کے آگے جنگل تھا۔ جنگل میں خطرناک جانور تو نہیں تھے لیکن پھر بھی بچے کھیلنے کُودنے اس طرف ذرا کم ہی جاتے۔ ایک دن چھٹی کے بعد خادم نے دوستوں سے کہا "بھئی آج گھر جانے کے بجائے چلو جنگل کی سیر کرتے ہیں۔" یہ سُنتے ہی اُس کے ساتھی فوراً تیار ہو گئے۔ انھوں نے مختار کو بھی دعوت دی لیکن مختار نے انکار کر دیا۔ اوّل تو اُسے شریر لڑکوں کی صُحبت بالکل پسند نہیں تھی۔ اور دوسرے والدین کی اجازت کے بغیر وہ کہیں نہیں جاتا تھا۔

ایک بار پھر اُس کا مذاق اُڑایا گیا۔ یہ شریر لڑکے کندھوں پر کتابوں کے بستے لٹکائے اسکول سے نکلے اور چیختے چلّاتے، کھیلتے کُودتے جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں اُنھیں جو بھی پرندہ نظر آیا۔ اُس پر انھوں نے

غلیل ضرور چلائی۔ جب وہ کھیتوں کی منڈیروں پر سے ہوتے ہوئے سنسان جنگل میں داخل ہوئے تو چار بج رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کبھی کبھار کسی پرندے کی آواز آجاتی۔ ورنہ سوائے اُن لڑکوں کی چیخ و پکار کے اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی۔ کیونکہ اس طرف آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔۔

چلتے چلتے وہ جوں ہی ایک بڑے درخت کے پاس پہنچے انھیں ایک بہت خوبصورت رنگ برنگی چڑیا نظر آگئی جو ایک ٹہنی پر بیٹھی اپنی ننھی سی دُم ہلا رہی تھی۔ اُس کے رنگ اتنے حسین تھے کہ اُسے دیکھتے ہی سب بچے کھل اُٹھے۔ خادم نے فوراً اپنی غلیل تانی، لیکن منیر نے اُسے روکا، "نہیں، نہیں خادم، خدا کے لیے اسے بخش دو"

"کیوں بخش دُوں؟" خادم نے پوچھا "تمہاری رشتے دار ہے کیا؟"

"نہیں بھائی، دیکھتے نہیں کتنی پیاری ہے اور کتنی ننھی منّی سی" منیر نے جواب دیا۔

"بکواس بند کر۔ یہ سب جنگلی پرندے ہیں۔ اللہ میاں نے اُنہیں پیدا اسی لیے کیا ہے کہ انسان ان کے شکار سے جی بہلائے" خادم نے کہا اور فوراً اپنی غلیل سے اُس کا نشانہ بنایا۔ پتھر ابھی غلیل سے نکلا بھی نہ تھا کہ چڑیا پُھر سے اُڑ گئی اور خادم کے ساتھیوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اب تو خادم کو غصّہ آگیا اور تیزی سے اس کی تلاش میں آگے بڑھا اس کے تمام ساتھی بھی چیختے چلّاتے اپنی غلیلیں تانے خادم کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

تھوڑی دیر کے بعد یکایک، ایک گھنے درخت کی ٹہنی پر اُنھیں وہ رنگین چڑیا نظر آگئی۔ اُسے دیکھتے ہی خادم کے سر پر بھُوت سوار ہو گیا "وہ دیکھو وہ بیٹھی ہے کم بخت۔ چلو سب مِل کر اُس پر حملہ کرتے ہیں۔ اب دیکھوں کہ کمبخت کیسے بچ کر نکلتی ہے۔" "ایک، دو، تین" اس کے ساتھ ہی بہت سے پتھر غلیلوں سے نکل کر اُس بے بس اور کمزور چڑیا کی طرف تیزی سے چلے۔ لیکن دوسرے ہی

نقل شدہ، طویل اور غیر معیاری تحریریں شائع نہ ہوسکیں گی۔

لمحے چڑیا پھُر سے ایک بار پھر اُڑ گئی۔ اس سے پہلے کہ یہ شریر لڑکے اُس کا پیچھا کرتے، وہاں ایک عجیب بات ہوئی اُن کی طرف اتنی بہت سی کنکریاں آئیں کہ اُن کی چیخیں نکل گئیں۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اُنھیں یوں لگا جیسے اَن گنت چیونٹے اُن سے چمٹ گئے ہیں۔ اب تو اُن کی جان نکل گئی اور وہ چیختے چلّاتے اُلٹے پاؤں شہر کی طرف بھاگے، لیکن وہ پُراسرار چیونٹے تھے کہ اُن سے چمٹ گئے تھے اور برابر اُن کا پیچھا کر رہے تھے۔

اُدھر شہر کے کچھ لوگوں نے دیکھا کہ بہت سے بچے سرپٹ بھاگے آرہے تھے اور بُری طرح چیخ رہے تھے...

اُن کی چیخیں سُن کر بہت سے لوگ گھروں سے نکل آئے اور بڑی مشکل سے اُن کی جان بچائی۔

دراصل ہُوا یہ تھا کہ جس درخت کی ٹہنی پر اس ننھی منّی چڑیا نے پناہ لی تھی۔ اُس پر شہد کی مکھیوں کا ایک بڑا چھتّا تھا۔ اُن لڑکوں نے بغیر دیکھے بھالے اندھا دھُند غلیل چلائی تو اُن کے پتھر چڑیا کے بجائے اُس چھتّے کو لگے جس پر جھنجھلا کر شہد کی مکھیوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ اس واقعے کے بعد کئی دنوں تک اُن شریر بچوں کے منہ، ہاتھ پیر، سُوجے رہے اور یہ لڑکے دن رات تکلیف سے بلبلاتے رہے۔ سُنا ہے کہ اُس دن کے بعد خادم اور اُس کے ساتھیوں نے اپنی شرارتوں سے توبہ کر لی۔

معلومات ہی معلومات

نیاز الدین نیازی، حوالی

۱۔ نظامِ شمسی میں نو بڑے بڑے سیارے شامل ہیں۔

۲۔ دنیا کے کل رقبے کے ۷۱ فیصد حصے پر پانی اور ۲۹ فیصد خشکی ہے۔

۳۔ دُنیا کا سب سے چھوٹا برّاعظم آسٹریلیا ہے۔

۴۔ دُنیا کا سب سے بڑا جزیرہ گرین لینڈ ہے۔

۵۔ دُنیا کا سب سے بڑا برِّاعظم ایشیاء ہے۔

۶۔ دُنیا کا سب سے بڑا سمندر بحرالکاہل ہے۔

۷۔ دُنیا کا سب سے بڑا ملک روس ہے۔

۸۔ دُنیا کا سب سے بڑا صحرا صحرائے اعظم ہے۔

۹۔ دُنیا کا سب سے لمبا دریا، دریائے ایمزن ہے۔

۱۰۔ دُنیا کی بلند ترین چوٹی کا نام ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔

۱۱۔ دُنیا کی عظیم بحری شاہراہ بحراوقیانوس ہے۔

۱۲۔ دُنیا میں سب سے زیادہ کافی برازیل میں پیدا ہوتی ہے۔

۱۳۔ دُنیا کا سب سے زیادہ خوشگوار آب و ہوا کا خطّہ بحیرۂ روم کا خطّہ ہے۔

۱۴۔ دُنیا کا سب سے اُونچا پُل سان فرانسسکو ہے۔

۱۵۔ لندن دُنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔

۱۶۔ پیرس دُنیا میں فیشن کی مصنوعات کے لیے مشہور ہے۔

۱۷۔ آبادی کے لحاظ سے دُنیا کا سب سے بڑا شہر ٹوکیو (جاپان) ہے۔

۱۸۔ دُنیا کی سب سے اونچی عمارت "ورلڈ ٹریڈ سینٹر" ہے۔ یہ امریکہ میں واقع ہے۔

۱۹۔ دُنیا میں سب سے زیادہ آبادی چین کی ہے۔

۲۰۔ دُنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن بنگلہ دیش میں پیدا ہوتا ہے۔

۲۱۔ دُنیا کا سب سے بڑا پہاڑ کوہِ ہمالیہ ہے۔

۲۲۔ ۱۹۸۰ء کی مردم شماری کے مطابق یورپ کی آبادی ۴۸۴ ملین تھی۔

۲۳۔ ۱۹۸۰ء کی مردم شماری کے مطابق افریقہ کی آبادی ۴۷۰ ملین تھی۔

۲۴۔ ۱۹۸۰ء کی مردم شماری کے مطابق شمالی امریکہ کی آبادی ۲۴۸ ملین تھی۔

غیبت و بدگوئی

تحریر:۔ عابد محمود توگیروی

غیبت کے معنی ہیں کہ "پیٹھ پیچھے بُرائی بیان کرنا" یعنی کسی کی غیر موجودگی میں بُرائی بیان کرنا۔ اور اُسے اچھے القاب سے یاد نہ کرنا۔ غیبت کرنا ایک گناہ کبیرہ ہے یہ ایک ایسا عمل ہے جو دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت اور دشمنی پیدا کرتا ہے۔

ہمارے پیاری صورت و سیرت والے نبیٔ اکرمؐ نے ہمیں غیبت و بدگوئی سے بچنے کی تلقین کی ہے۔

مگر بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں یہ عظیم گناہ کثرت سے کیا جاتا ہے، جہاں چند لوگ اکٹھے ہوں گے،

وہاں کسی نہ کسی کی بُرائی ضرور بیان کر رہے ہوں گے۔ جب کبھی کلاس میں کوئی لڑکا پڑھائی میں ہم سے بڑھ رہا ہو تو ہمیں اس پر شدید غصہ آتا ہے۔ اس لڑکے کی غیر موجودگی میں ہم اپنے دوستوں میں اس کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں۔

"یار وہ ہے نا عمرانی۔ یار وہی موٹا سا، بڑے سے ناک والا۔ کل تک تو آوارگی کرتا تھا۔ آج کل کلاس میں پھنے خاں بنا ہوا ہے"۔ یہ سراسر غیبت و بدگوئی ہے۔

ہمارے معاشرے میں اس گناہ کو پھیلتے ہوئے دیکھ کر بانیٔ قومی شاعری مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی ایک رُباعی میں کچھ اس طرح شکایت کی ہے۔

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئی خلق ہے ہر اک محبت میں
اوروں کی بڑائی ہی پہ ہے فخر و ہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمت میں

غیبت کرنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ یہ مندرجہ ذیل "مشکوٰۃ" کی حدیث سے واضح ہو جائے گا۔

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "غیبت زنا سے سخت تر عمل ہے"۔ لوگوں نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ! غیبت زنا سے سخت گناہ کیوں کر ہے؟ آپؐ نے فرمایا "آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ اُس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے، لیکن غیبت کرنے والے کو معاف نہیں کرے گا۔ جب تک وہ شخص اُس کی معافی نہ دے دے۔ جس کی اُس نے غیبت کی ہے"۔

تو بات صرف یہی ہے کہ ہم جہاں اکٹھے ہوں کسی کی غیبت نہ کریں۔ اس کو واقعی ایک سخت گناہ سمجھیں اور کسی کو بُرے القاب سے یاد نہ کریں۔ اکثر ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ آج کل ہم (مسلمان) کیوں ساری دنیا میں خوار ہو رہے ہیں؟ اس لیے کہ ہم نے کئی ایسے گناہوں کو گناہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔

میں اپنی طالب علم برادری سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ خود بھی اس قبیح گناہ سے بچیں اور دوسروں کو بھی اس سے بچائیں۔

اگر بھولے سے ہم نے کسی کی غیبت کی ہو تو مندرجہ ذیل حدیث ہماری مدد ثابت ہو سکتی ہے۔

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "غیبت کا ایک کفارہ یہ بھی ہے کہ تو اس شخص کے لیے دعائے مغفرت کرے جس کی تُو نے غیبت کی ہے؛ تو یوں کہے کہ اے اللہ! تُو میری اور اس کی مغفرت فرما"۔

بلیک بکس

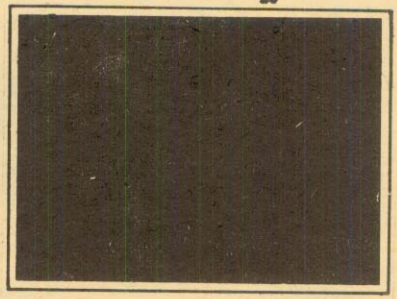

"اگر آپ مستقبل کے اچھے اور نیک نام ادیب بننا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ آپ کا نام بلیک لسٹ میں نہ آنے پائے"۔

سالگرہ کے ساتھی

محمد بوٹا راجہ ۔ ہفتم جاری

۱۴ راکتوبر ۷۷ ۱۹ء

کرکٹ، مطالعہ، سائیکل چلانا

انگلش، اُردو، پنجابی، شریف شہری

کرم سیالی گورنمنٹ مڈل اسکول وکیل والہ تحصیل ننکانہ صاحب ۳۹۱۸۱ شیخوپورہ

نصیر الحفیظ دہم

۱۲ راکتوبر ۱۹۷۳ء

کرکٹ کھیلنا، ریاضی، انگلش

فوجی بننا چاہتے ہیں۔

گورنمنٹ ہائی اسکول کندھ کوٹ

ریحان ، دہم

۱۰ راکتوبر ۱۹۷۳ء

آنکھ مچولی پڑھنا، سائنس

انجینئر بننا چاہتے ہیں

صغیر سینٹر فیڈرل بی ایریا کراچی نمبر ۳۸

محمد سمیع اللہ - نہم

۱۱ راکتوبر ۱۹۷۵ء

مطالعہ کرنا قلمی دوستی، اسلامیات

ایک اچھا انسان

محمد سمیع اللہ کلاس نہم سی فیڈرل گورنمنٹ بوائز مڈل اسکول نمبر ۱۱۴ آئی ۹ اسلام آباد

عمر فاروق - ہشتم

۱۰ راکتوبر ۱۹۷۶ء

قلمی دوستی کرنا ، عربی ،

پائیلٹ بنیں گے۔

گورنمنٹ ہائی اسکول جھیسور انوالی تحصیل وضلع گجرات

محمد مبین سحر ، نہم

۱۰ راکتوبر ۱۹۷۳ء

قلمی دوستی کرنا، رسالوں میں لکھنا

دینیات، ریاضی، کیپٹن کمانڈر

۷۵۰۵۰

سی او ماموں کریانہ اسٹور، ۱۹۷/۲۵۶ نزدیک الیف ساؤتھ کراچی

مزمل احمد خان - نہم

۲ راکتوبر ۱۹۷۶ء

ڈاک ٹکٹ اور سکے جمع کرنا ۔

بیالوجی ۔ ڈاکٹر

۸-۶/T الاعظم اسکوائر ۵-F ایریا کراچی نمبر ۳۸

عبدالرحیم ولی محمد ، دہم

۲۰ راکتوبر ۱۹۷۴ء

آنکھ مچولی پڑھنا، انگلش

جج بنیں گے ۔

عائشہ محل ۲ فیڈرل بی ایریا کراچی

عدنان علی ، نہم

۱۰ راکتوبر ۱۹۷۳ء

کرکٹ کھیلنا، مطالعہ کرنا

فزکس، پائیلٹ بنیں گے۔

مکان نمبر ۳۶ گلی نمبر ۲۷-کینال پارک گلبرگ لاہور

سید وجاہت علی ، ششم
یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء
کیرم بورڈ کھیلنا، آنکھ مچولی
پڑھنا، سائنس، انجینئر بنیں گے

ضلع بدین تحصیل گولارچی سینٹر بازار معرفت خالد محمود نزد آئس فیکٹری گولارچی

شکیل احمد کلوڑ ، دہم
۱۹ اکتوبر ۱۹۷۴ء
بیڈمنٹن کھیلنا، سائنس
انجینئر بنیں گے۔

محمد ابراہیم کلوڑ اسٹامپ وینڈر گھوٹکی

حبیب خان ، پنجم
۳ اکتوبر ۱۹۷۹ء
کتابوں کا مطالعہ کرنا، اُردو
آرمی آفیسر بنیں گے۔

۱۸۸ گلشن فاطمہ ، اوکاڑہ۔

محمد اعجاز خان بابر ، ہفتم
دو اکتوبر ۱۹۷۵ء
اُردو ، مطالعہ، کہانیاں
لکھنا، پائیلٹ بنیں گے

کوارٹر ایل ایم سی پی ۲۱۲ کالونی جامشورو

عارف ناز ، دہم
یکم اکتوبر ۱۹۶۸ء
پینٹنگ آرٹ، اُردو،
بینک مینیجر بننا چاہتے ہیں

۷۶۰۹۰-پی کا ٹیپو سلطان روڈ سعید آباد بلدیہ ٹاؤن کراچی نمبر ۵ ۔ عارف ناز

جندیو کمار بیراگی دہم
یکم اکتوبر ۱۹۷۴ء
کرکٹ کھیلنا، بائیالوجی،
ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں

ڈاکٹر میٹھا رام بیراگی ہاؤس عمرکوٹ تھرپارکر

فارق برکت علی - نہم
۱۸ اکتوبر ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا، حساب، بزنس مین
بننا چاہتے ہیں۔

اے۔بی وی ۱۴۹، گارڈن ایسٹ کراچی نمبر ۳۔

سید شان الحق ، نہم
۲۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء
دینی کُتب کا مطالعہ کرنا، مطالعہ
پاکستان ۔ ڈاکٹر

۱۱۳/۱۸۸ اے بالائی منزل جیل روڈ میر آباد، حیدرآباد

فیض رسول ناصر دہم
۲۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء
بیڈمینٹن کھیلنا، سائنس
پائیلٹ بنیں گے۔

معرفت یوسف ہوٹل والا بس اسٹاپ کندیاں ضلع میانوالی

شہاب ۔ ہفتم اے
۱۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا، انگریزی، گلوکار
بننا چاہتے ہیں ۔

چاکی پاڑہ، شالیمار بیکری میرپور خاص

آصف وقار آصف دہم
۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء
مطالعہ آنکھ مچولی، اُردو
نیک ڈاکٹر بنیں گے۔

سی۔بی ۵۷۰ - علامہ اقبال روڈ لالہ زار - واہ کینٹ

سید جعفر علی شاہ عابد۔ دہم
۱۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء
سیر و تفریح کرنا، مطالعہ کرنا
انگلش، اُردو، بینک آفیسر

مکان نمبر ڈی ۲۱۸، وارڈ نمبر ۲ محلہ مچھلی محل لودھراں ضلع ملتان

راشد حسن ۔ ہشتم
۲۹ اکتوبر ۱۹۷۷ء
آنکھ مچولی پڑھنا، اسلامیات
پائیلٹ بنیں گے۔

بھیانی اسکوائر ۳۴۴ بی بلاک جی نارتھ ناظم آباد کراچی

خالد زکریا ، نویں
۸ اکتوبر ۱۹۷۴ء
مطالعہ کرنا، مطالعۂ پاکستان
بزنس مین بنیں گے۔

فلیٹ نمبر ۹، ۴ فلور الالٰہی منزل شاہراہ لیاقت کراچی

عبدالجبار میرانی ، دہم
۲۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء
سائنسی کتابیں پڑھنا، بائیالوجی
سائنسدان بنیں گے۔

چادر بازار پیر گوٹھ پوسٹ آفس پیر گوٹھ، ضلع خیرپور میرس

نام ______ جماعت ______
تاریخ ماہ و سنِ پیدائش ______ مشاغل ______
پسندیدہ مضمون ______ بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ______
پتہ ______

شین فاروقی

امّی ابّو کا صفحہ

اکثر والدین اپنے بچّوں کو گفتگو میں گندے الفاظ استعمال کرتے دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بچّوں کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ بچّوں کی نفسیات سے واقفیت نہ رکھنے والے غصّہ ور والدین ایسے موقعے پر بچّوں کی پٹائی کر دیتے ہیں یا اُنھیں بُری طرح ڈانٹ دیتے ہیں۔ کم والدین ایسے ہوتے ہیں جو اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ان کے بچّے اگر گندی زبان استعمال کر رہے ہیں تو کیوں؟ نیز یہ کہ بچّوں سے گندی زبان کا استعمال ترک کرانے کا مناسب اور صحت مند طریقہ کیا ہے؟

عام مشاہدہ ہے کہ بچّے اخلاق سے گرے ہوئے الفاظ اپنے بُرے دوستوں کی صحبت میں یا پھر بڑوں سے سیکھتے ہیں۔ بچّوں کے گندی زبان استعمال کرنے کے کئی اسباب ہیں۔ گندی زبان بولنے والے بچّوں کے مشاہدے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر بچّے جھنجھلا کر یا غصّے اور اشتعال میں آکر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ بچّے اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے اور اپنے سے چھوٹوں پر رعب جمانے کے لئے بھی گندے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

جو والدین گندی زبان کے مندرجہ بالا اسباب سے واقف نہیں ہوتے وہ بچّوں سے گندی زبان کا استعمال چھڑانے کے لئے بچّوں کو مارتے پیٹتے ہیں۔ بلا شبہ اصلاح کے ضمن میں ڈرانے دھمکانے کا بھی اپنا ایک اثر ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا کرنا بھی چاہئیے مگر زندگی کا عام تجربہ بتاتا ہے کہ بچّے مار پیٹ سے ذرا کم ہی سُدھرتے ہیں۔ چنانچہ بچّوں کو بُری عادتوں اور خاص طور پر گندی زبان کے استعمال سے نجات دلانے کے دو صحت مند طریقے ہیں۔

اوّل تو اُن کی صُحبت اور ماحول کو بدلا جائے۔ ماحول کا بچّے گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ نہایت محبّت اور شفقت سے اُنہیں بتائیے کہ اُن الفاظ کا استعمال نہ صرف یہ کہ بہت سے لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوگا بلکہ لوگ انہیں اچھی نظروں سے بھی نہیں دیکھیں گے۔ اس بات کو یقینی بنائیے کہ آپ کا بچّہ بُری صُحبت سے محفوظ رہے۔

مسئلہ کا مستقل، پائیدار اور صحت مند حل، محبت، رعایت اور ذہانت کے استعمال میں پوشیدہ ہے اچھے اور تعلیم یافتہ والدین کے پاس ان تینوں عناصر کی کمی نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

احمد

آلو بخارے کی چٹنی

تازہ، خالص اجزاء۔ ذائقے کی شناخت

دسترخوان پر آلو بخارے کی چٹنی کھانے کا لطف دوبالا کر دیتی ہے۔
آلو بخارا ہاضمے کے لئے خصوصاً اور صحت کے لئے عموماً انتہائی مفید ہے۔
آلو بخارے کی چٹنی احمد کی اشیائے خوردنی میں نیا اور قابلِ قدر اضافہ
قدرت نے ذائقہ دیا ــــ احمد نے محفوظ کیا

REGD. NO. M–266

OCTOBER 1989

MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI

معیاری خوردنی اشیاء کی پہچان
اس کے اجزاء

قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا